اپنی مٹی کی مہک

(افسانوی مجموعہ)

اشفاق برادر

اپنی مٹی کی مہک

(افسانوی مجموعہ)

اشفاق برادر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

APNI MITTI KI MEHAK

(Short Stories)

by

Ashfaq Birather

Year of Edition 2011
ISBN 978-81-8223-895-4
Price-Rs.150/-

نام کتاب : اپنی مٹی کی مہک (افسانوی مجموعہ)

مصنف : اشفاق برادر

پتہ : (A-I) 132/58, Babu Purwa, Kanpur- 208023 (UP)

قیمت : ۱۵۰ روپے

سن اشاعت : ۲۰۱۱ء

کمپوزنگ : اسمائل گرافکس، چمن گنج، کانپور

سرورق : مصطفیٰ کمال پاشا

مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

والدین کریمین کے نام

جن کا سایہ کرم اور محبتیں

آج بھی میرے ساتھ ہیں۔

(اشفاق برادر)

فہرست

☆	اشفاق برادر کے افسانوں میں عصری شعور... عشرت ظفر	7
☆	کچھ اپنے بارے میں.............اشفاق برادر	11
۱۔	روپ	14
۲۔	لہو ہوتی تصویر	18
۳۔	فضائے بے اماں	21
۴۔	بہتان	26
۵۔	شور	29
۶۔	کہانی۔ایک اور...........	33
۷۔	فیصلہ	37
۸۔	رنگوں کا کاشتکار	41
۹۔	انداز نرالے ہیں بھیا	44
۱۰۔	آمین	50
۱۱۔	زندگی دوسروں کے لئے	53
۱۲۔	آبشار کا درد	57
۱۳۔	تصویر	60
۱۴۔	صبح کے لٹیرے	64
۱۵۔	ماضی کا داغ	69
۱۶۔	اپنی مٹی کی مہک	72

۱۷۔	اب بھی وقت ہے	76
۱۸۔	فیشن یافتہ	78
۱۹۔	زخم زخم حصار	81
۲۰۔	موقع اپنا اپنا	85
۲۱۔	فرق لوگوں کا	89
۲۲۔	احساس	93
۲۳۔	دیوانہ	95
۲۴۔	سچا جانشین	98
۲۵۔	محبت	102
۲۶۔	پھر وہی بات	105
۲۷۔	ٹوٹے ہوئے جذبے	110
۲۸۔	کنڈوم	113
۲۹۔	مضطرب خواب	116
۳۰۔	تغیر	119
۳۱۔	تبدیلی	122
۳۲۔	جہاں۔اپنا اپنا	125
۳۳۔	کاش.............	130
۳۴۔	بوڑھا فقیر	133
۳۵۔	بکھرا وجود	138
۳۶۔	کوئی تو وقت ہوگا	141

☆☆

اشفاق برادر کے افسانوں میں عصری شعور

عشرت ظفر

اردو افسانے نے بیسویں صدی کے وسط سے ہی اپنے خدوخال کے ذریعے ایسے مناظر دکھانا شروع کر دیئے تھے کہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اکیسویں صدی فکشن کی ہی صدی ہوگی۔ شاید ان قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی ایک تقریر میں اس طرف اشارہ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جیسے جیسے بیسویں صدی اپنے اختتام کی طرف بڑھتی گئی اردو افسانے کا افق بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ دنیا ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ انسانی تہذیب نے کروٹ لی اور جو جسارت خلوت میں بھی ممنوع تھی وہ جلوت میں ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ سچا قلم کار وہی ہے جو نمایاں روشن اور بیباک تصویر پیش کرے۔ ادب کا تقاضا بھی یہی ہے اور قلم کار کا فرض بھی یہی ہے چنانچہ بیسویں صدی ختم ہونے سے پہلے ہی افسانہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ اردو کے ایوانِ ادب میں نمودار ہوئی جس کے پاس وہ سب تھا جو ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ اس نے ماضی کی بازیافت کے عمل کو نہیں دہرایا ماضی کو اپنی کہانیوں کا استعارہ نہیں بنایا بلکہ وہ سب کچھ لکھا جو ان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا تھا۔ اس طرح اکیسویں صدی کے شروع دہے سے پہلے ہی اردو افسانے نے ایک بڑی کروٹ لی اور

جو ناسور اور زخم نئی تہذیب نے دیئے تھے ان کی تفسیر و تشریح کا کام شروع ہوا اور کوچہ و بازار میں بکھرے ہوئے گرد و پیش کے مناظر سامنے آنے لگے۔ ادب زندگی کی پیچیدگیوں کو واضح کرتا ہے۔ ادب صالح قدروں کا ہم نوا ہوتا ہے۔ ادب ان مناظر پر طنز ہوتا ہے جن میں اخلاقی پستی ہو عریانی ہو یا فحاشی ہو چنانچہ ہر طریقے سے زندگی کی تصویر پیش کی جاتی ہے لیکن اصل قدروں سے انحراف نہیں کیا جاتا ہے افسانہ نگاروں کی وہ نسل جو بیسویں صدی کے آخری دنوں میں نمودار ہوئی اس میں اشفاق برادر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ کانپور میں اگرچہ افسانہ نگار انگلیوں پر گنے جانے کے برابر بھی نہیں لیکن جو ہیں ان میں اشفاق برادر کی کہانیاں خاص اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ وہ فقط بیانیہ نہیں ہیں بلکہ انسانی سماج پر طنز ہیں ان میں زندگی کی صالح قدریں ہیں جو زندگی کا اصل جوہر ہیں اس کی روح میں ظاہر ہے کہ بے باکی بے چینی نہیں نہ فحش مناظر بیان کئے ہیں بلکہ بے باکی ہے۔ جہاں زندگی کی شفاف و منزہ خد و خال کو نگلنے کے لئے تاریکی بڑھ رہی ہو گمراہی پھیل رہی ہو وہاں اپنی بات کہی جائے۔ ان کے اس افسانوی مجموعے میں کم و بیش ۲۶ افسانے ہیں جن میں انہیں مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے جو آج کے جلتے ہوئے حقائق ہیں۔ طنز کی کاٹ ہے اور یہی اشفاق برادر کی سوچ کا حصہ ہے۔ قلم کار کے یہاں قلم پر گرفت نمایاں ہے۔ جس میں شوخی و بے باکی کا عنصر ہے۔ اور یہ عنصر ان کے یہاں ہے اس طرح ان کی سوچ میں عصری بیقراری پوری طرح موجود ہے۔ اشفاق برادر کی زبان صاف ہے جس میں ایک طرح کا بہاؤ ہے جس طرح کا سب خرام پانی بہہ رہا ہے ان کے افسانے پڑھ کر مجھے خاص طور پر احمد مشتاق کا یہ شعر یاد آیا۔

یہ دریا خاموشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

اشفاق برادر کے افسانے جو اس کتاب میں شامل ہیں ان میں آبشار کا درد، اپنی مٹی کی مہک، سچا جانشین، کنڈوم، شور، بوڑھا فقیر بہترین افسانے ہیں۔ چونکہ آج

کا زمانہ گروہ بندی کا ہے ادبی ساز باز جوڑ توڑ کا ہے اس لئے اشفاق برادر اس انداز سے سے بچ نہیں سکے جس طرح کاش ان کے پاس ہے لیکن ہندو پاک کے مقتدر جرائد میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اہل قلم ان سے واقف ہیں اور میں تو یہ سوچتا ہوں کہ تخلیقیت کا سب سے اہم پہلو ہی ہے کہ تخلیق کار اپنا کام کرتا رہے اور وہ بڑی حد تک مجبور بھی ہوتا ہے اپنا کام کرنے پر یعنی نقوش ہیں تخلیق کرنے اس کو اس بات کی فکر نہیں ہوتی ہے کون اسے جانتا ہے کون نہیں جانتا ان کا احساس شدید ہے جو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ کہانی لکھیں اور اسی تخلیق جو سماج کے تمام پہلوؤں کی عکاس ہو ان کی کہانی شور کا یہ پیراگراف قابل ملاحظہ ہے جس میں سماج کے اس پہلو کی نمائندگی ہوتی ہے جہاں مرد جسم فروش ہے:

''وہ بھی ایک علاقائی دادا کے چکر میں آ گیا تھا۔ وہ خوبصورت تو تھا ہی ، دادا کی پارکھی نگاہوں نے اس کو پسند کر کے، اس کے لئے کام بھی سوچ لیا، دادا نے اس کو کھانا اور بہترین کپڑے مہیا کرائے، غرض کہ وہ ہر چیز اس کو دی جو اس کی خوبصورتی کو اور نکھار دے۔ وہ یہ سب پا کر بہت خوش ہوا مگر اس کے بعد تو وہ دادا کے چکر میں گھومتا ہی چلا گیا۔ جب ایک دن دادا نے اس کو بلا کر کہا کہ اب تو دھندے کے لیے پوری طرح سے فٹ ہو چکا ہے اور تجھے آج شام سے ہی کام شروع کر دینا ہوگا؟ پھر اس نے دادا سے پوچھا کہ اس کو کیا کرنا ہوگا؟ دادا نے بتایا کہ تیری اس کے ساتھ بکنگ ہو چکی ہے، اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہاں میک اپ سے لپی پتی ایک چوڑے بدن کی ادھیڑ عورت موجود تھی جو اس کو بڑی دل آویز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر شرارت رقص کر رہی تھی، اس نے دادا سے پھر پوچھا کہ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا

ہوگا؟ اس پر دادا نے برا سا منھ بنا کر کہا کہ سالا تو نوجوان کیوں ہے؟ یہ تجھے سب بتا دے گی کہ تجھے کیا کیا کرنا ہوگا؟"

اشفاق برادر ایک بیدار افسانہ نگار ہیں جن کی آنکھیں ہمہ جہت کھلی رہتی ہیں اور وہ اپنی تمام مناظر سے سے کہانی کے پہلو اخذ کر لیتے ہیں۔ میں نے ان کے تمام افسانوں کو پڑھا ہے اور افسانہ نگار کے مشاہدے سے مطالعہ اور فکر کی گہرائی کا احساس کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب اہل دانش و بینش میں بے حد پسند کی جائے گی۔

کچھ اپنے بارے میں

۱۹۸۰ء کے آس پاس میں نے لکھنا شروع کیا۔ ادب پڑھنے کی عادت ہائی اسکول ۱۹۷۷ء میں پاس کرنے کے بعد شروع ہوئی۔ میرے گھر اور محلّہ کا ماحول مجھے آگے پڑھنے اور لکھنے کی برابر ترغیب دیتا رہا۔ خود کے بارے میں لکھنا بھی ایک عجیب طرح کا کام محسوس کر رہا ہوں۔

شروع سے ہی میرے والد محترم مصطفےٰ برادر کے پاس طرح طرح کے سماجی وسیاسی معاملات آتے رہے، کپڑے کی تجارت ہمارے یہاں ابھی تک ہو رہی ہے، ہم لوگ جہاں رہتے ہیں وہاں مزدوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ غریبی اور ناخواندگی کے مختلف روپ اور مسائل ہوتے ہیں جن کا میرے ذہن پر بھرپور اثر ہوتا رہا اور میرے جذبات واحساسات ماحول میں بکھرے درد کے ساتھ جوان ہوتے رہے، میرے یہاں سے مدد بھی ہوتی اور دلاسہ بھی دیا جاتا۔ میری والدہ زیب النساء صاحبہ کے پاس تو کوئی نہ کوئی خاتون اپنی بات کہنے اور مدد مانگنے آتی رہی رہتی۔ والدہ صاحبہ بتایا کرتی تھیں کہ ہم نے غریبی دیکھی ہے جہاں تک ہوسکے مظلوموں، بے سہاروں کی مدد کیا کرو۔۔ پورا علاقہ جانتا ہے۔ ایک علاقائی بدمعاش نے میرے ایک کرائے دار کو بھڑکا کر ناجائز مقدمے بازی شروع کرادی۔ جس سے میری پڑھائی متاثر ہوگئی۔ اگر آپ سماج میں کوئی مقام رکھتے ہیں تو لوگ خوامخواہ آپ سے..........

ان باتوں کا میرے دل ودماغ پر کچھ اس طرح اثر ہوا کہ میں نے افسانہ

لکھنا شروع کردیا۔ میں نے بہت کچھ پڑھا۔ میرے ماموں محمد یوسف صاحب جاسوسی ناولیں بہت پڑھا کرتے تھے اور محلے میں تاریخی ناولوں کو پڑھ کر سنانے کا بھی چلن تھا وہاں مجھ سے پڑھوایا جاتا تھا۔ وہ بزرگوں کی ٹولی اب نہیں رہی۔ ماموں تو اب بھی پڑھتے ہیں۔ مجھے بھی شوق جاگا اور میں بھی شکار ہو گیا جبکہ میری نانی زیتون النساء مرحومہ ڈانٹتی رہتی تھیں۔ اس درمیان میں نے ایم۔اے۔(سیاست)، ایل۔ایل۔بی۔ پاس کر لیا تھا۔ سیاسی رنجش کی بنیاد پر شرپسند عناصر کو اکسا کر میرے والد کو مالی نقصان بھی پہونچایا گیا۔

ان بے جا حرکتوں سے پورا گھر متاثر ہوا اور اس کا بھی اثر میرے ذہن وفکر پر پڑا۔ چونکہ ادبی سنگت تھی اس لئے تخلیقی ادب کی جانب متوجہ ہوا۔ فلم سنسار میں میری پہلی کہانی شائع ہوئی۔ پھر ایک سلسلہ چل پڑا جو آج تک جاری ہے۔

سماج میں ظلم وستم، استحصال، امیری غریبی، اونچ نیچ، ذہنی دباؤ، ترقی کے پیمانے، ٹوٹتے رشتے ناطے، معنویت کھوتے ہوئے چہرے، احساسات وجذبات رکھنے والوں کو زمانہ دوسرے انداز میں دیکھ کر تنقیدیں کرتا۔ جو چیزیں معیوب تھیں۔ آج کھلے پن میں آچکی ہیں، پیسوں کے لئے انسان وہ سبھی کچھ کرنے کو تیار ہے جو کبھی غیر انسانی وغیر اخلاقی تھیں۔ انسانی ذہن جہاں دنیاوی زندگی اور مسائل میں آئے پر پیچ زاویوں کو محسوس کر رہا ہے، عیاں کر رہا ہے، کہانی کار اپنی تخلیق میں انہیں سب باتوں کا اظہار واقرار کر رہا ہے۔

خود پسندی، طاقتوری کا نشہ دنیا کے مختلف حصوں میں بربادی تباہی کے نام پر اور آزادی کے نام پر موجود ہے۔ انسانی جذبات واحساسات کو جس طرح مسمار کیا گیا ہے، انسانیت اس سے مجروح ہو چکی ہے، کراہ ہی نہیں اپنے وجود پر رو رہی ہے۔

اخبارات، ٹی وی اور انٹرنیٹ نے دنیا کی تصویر بدل دی ہے۔ عام انسان تو اپنے معاملات میں اُلجھا ہوا ہے مگر جو احساس کی دولت سے آراستہ ہے بے چین و بے قرار ہو کر اپنے کرب کو زبان دینے میں لگ جاتا ہے۔ میں نے افسانوی ادب

پڑھا ہے اور زبردست متاثر بھی ہوا ہوں۔ ادب کو اصلاحی پہلوؤں سے دیکھتا ہوں، حال اور ماضی کے تناظر میں رکھ کر کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ادب برائے اصلاح میرا یقین ہے۔

میرے والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں دو بھائیوں نوشاد برادر، شمشاد برادر اور بہنوں رضیہ سلطانہ، صافیہ بیگم اور عالیہ ناز میں سب سے بڑا ہوں۔ والدین کی مہربانیاں ہم بھائی بہنوں پر کچھ اس طرح سے ہوئیں کہ خیر کے ساتھ ہمارے درمیان آج بھی موجود ہیں۔ پودے کو درخت بنانے میں جو ذہن وفکر باعمل ہوتا ہے وہی سب کچھ تھا ان کی یاد سے ابھی بھی ایک لمحہ کو غافل نہیں ہوں۔

مجھے اردو اور تخلیقی عمل سے جوڑنے، ان کی نوک پلک سمجھانے سنوارنے میں جن بزرگ حضرات نے انگلی پکڑ کر رہنمائی کی، حوصلہ بخشا، توانائی عطا کی وہ وقت کے اعلیٰ ترین شاعر، ادیب، صحافی وناول نگار کے ساتھ ساتھ ہی اردو دنیا میں اپنا اثر ومقام رکھنے والے ہیں۔ میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ ان کا سایہ قائم ودائم ہے۔

محترم جناب عشرت ظفر، ظفر اقبال ظفر اور الحاج حق بنارسی مرحوم (مولوی صاحب) جنہوں نے مجھے اردو ادب سے متعلق عصری کتابیں پڑھنے کے لئے دیں جو میری دسترس سے باہر تھیں۔

اس مجموعے کی ترتیب میں یاوروارثی، مولانا محمد قاسم حبیبی برکاتی، نصیر نادان، ڈاکٹر جمال فتح پوری، قمر صدیقی، ضیاء کانپوری، محشر کانپوری، زبیر ادیب، ڈاکٹر مقصود اختر، چودھری نفیس، ماسٹر عبدالسلام، چنو بھائی، اور نورالھدی (پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اسکالر) صاحبان کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں اور جو مجھے ہر وقت لکھنے پڑھنے پر زور دیتے رہے خصوصی طور پر ڈاکٹر اقبال انصاری کی محبتیں شامل حال رہیں۔

اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور فیصلہ کے حقدار بھی آپ ہی ہیں۔

اشفاق برادر

☆☆

روپ

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ذہن پر زور دینے لگا۔ہاں، یاد آیا۔ روزون سے میں تین ہفتے پہلے مل چکا ہوں۔پولیس حراست میں اس کی موت کی خبر پڑھ کر میں چونک پڑا۔میری اور اس کی بحث کا محور تھا، پھول اور اس کی مہک۔پھولوں کی نمائش آزاد پارک میں دو روز سے لگی ہوئی تھی۔

میں پھولوں کا دیوانہ مانا جاتا ہوں۔مختلف لوگوں کا کچھ اس طرح کا خیال ہے لیکن میں تو خوبصورتی کا متلاشی ہوں۔خاص کر پھولوں کی دلفریب خوبصورتی مجھے اپنے وجود سے بیگانہ کر دیتی تھی۔مجھے کانٹوں سے بھی پیار تھا جو پھولوں کی حفاظت کرتے اور زندگی کا درس دیتے ہیں۔جہاں پھول خوشی دیتے ہیں وہیں کانٹے درد۔

روزون بھی خوشبوؤں کا شوقین تھا۔اس نے مجھے عطروں کے اتنے نام اور فوائد بتائے کہ مجھے ایک بھی یاد نہیں رہے۔اس کی باتوں نے مجھے متاثر کیا۔اچھی اور صحیح جانکاریاں اس کے پاس تھیں۔تبھی تو روزون مجھ سے الجھ پڑا تھا مگر پولیس حراست میں اس کی موت کا معمہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔پولیس کے مطابق روزون اسمیک کا عادی تھا۔اس کے پاس سے پچاس پڑیا اسمیک برآمد ہوئی تھی۔کچھ نام اور پتے بھی ملے جن سے روزون اسمیک خریدتا تھا۔میری اپنی جانکاری تھی کہ روزون عطر فروش تھا۔ اس کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔لکھنؤ میں اس کی رہائش تھی۔ پیدائش کہاں کی تھی یہ نہیں معلوم۔اس کی ایک بوڑھی ماں بھی تھی۔روزون اپنی بوڑھی ماں کا کچھ زیادہ خیال نہیں

رکھتا تھا مگر پھر بھی ضروریات پوری کر ہی دیتا تھا۔ میری نگاہ میں یہ برا عمل تھا۔ بوڑھوں سے محبت کرنی چاہئے کیونکہ یہ عزت اور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ آج کمزور ہیں، ہمدردی چاہتے ہیں اپنی زندگی جی چکے اور اب موت کا انتظار ہے۔ مرنا تو سب کو ہے۔ روزون سے میری دوستی نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں بھی ایک پولیس والا ہوں لیکن آج کل والا نہیں، روپیہ کسے نہیں چاہئے یہ سوچ تو عام ہے مگر مجھے تو صرف اپنی محنت کا ہی روپیہ چاہئے، رشوت یا دوسرے طریقوں کا نہیں۔ میں اپنا سکون غارت نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ روپیہ نیندیں چرا لیتا ہے ....روزون کے بارے میں تھانہ پہنچ کر جانکاری حاصل کی۔ مجھے دلچسپی لیتا دیکھ کر پولیس والوں کے ماتھوں پر بل پڑنے لگے، ان کے اس انداز سے میں نے محسوس کیا کچھ گڑبڑ ہے، کیا ہے؟ شک کی سوئی گھومنے لگی اور میں نے جائزہ لینا شروع کر دیا تو میں حیران رہ گیا کہ اسمیک پینے کا کوئی بھی نشان اُس کی دسوں انگلیوں میں نہیں تھا۔ روزون کا بدن صاف ستھرا تھا جبکہ اسمیک پینے والا پانی سے بھاگتا ہے، برائے نام کھاتا ہے۔ اس کی صحت اور شکل دیکھ کر یہ اندازہ تو ہو ہی جانا چاہئے۔ کتنا چھپائے خود کو۔ اسمیک تو دور سے بولتی ہے۔ پھر میں نے موت کی وجہ جانی جو مجھ کو بالکل فرضی لگی۔ سر! اسمیک نہ دینے کی وجہ سے مر گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پولیس اسمیک پینے والے کو خود مہیا کراتی ہے، اگر کوئی اسمیک پینے والا پکڑا گیا ہو کیونکہ اسمیک نہ ملنے پر چیخنا، چلانا، تڑپنا اور سر پٹکنا تو عام بات ہے۔ پھر روزون کی موت۔ میں نے تحقیقات شروع کی۔ روزون تھانے کیسے پہنچا؟ بتایا گیا مخبری۔ کون مخبر ہے؟ تو کافی دیر بعد معلوم ہوا کہ اسکو موٹر سائیکل چیکنگ کے دوران روزون کو پکڑا گیا۔ اسکوٹر کی ڈگی میں ایک لاکھ تیس ہزار روپے نقد تھے۔ ظاہر ہے یہ رقم تجارت کی تھی جو روزن کو کسی تاجر سے ملی ہوگی اور یہ کوئی بڑی رقم بھی نہیں تھی اس کی تجارت کو دیکھتے ہوئے۔ روزون عطر اکسپورٹر بھی تھا۔ لالچ نے اپنا کام دکھایا اور پولیس نے ایک

فرضی اسٹوری ظاہر کر کے اس کا پورا روپیہ ہڑپ لیا اور اتنا ٹارچر کیا کہ موت ہو گئی۔ پولیس اس کے روپیوں کو حوالہ سے جوڑ کر پوچھ تاچھ کرنے لگی تھی۔ رات کا وقت تھا اور پولیس والے نشے میں تھے۔ کچھ نئی بات نکالنے کے چکر میں روزن کی موت ہو چکی تھی۔ روزن کی موت سے پولیس والوں کے ہوش اڑ چکے تھے۔ معاملے کو ایک نیا رخ دینے کی خاطر انہوں نے اپنی تمام کاروائی شروع کر دی تھی۔ سر! ہم لوگوں سے غلطی ہو گئی۔ سر! معافی دی جائے۔ سر! محکمے کی عزت کا سوال ہے۔ سر! ہم لوگوں نے پچھلے دنوں جالی نوٹوں کو چلانے والے گروہ کے دو افراد پکڑے تھے۔ سر ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ پیر پکڑتے ہیں سر! اور دوسرے رشتوں کی دہائی دی گئی۔ بے گناہ کا خون۔ روزون کے افکار میرے سامنے تھے میں محافظوں کی ایک بھی بات مان نہیں سکا اور ان سبھی کے خلاف قتل اور روپیوں کو چھین لینے کا مقدمہ درج کرا دیا۔

روزون کی میت کی تکفین بھی کرا دی گئی لیکن اس کی بوڑھی ماں کے بارے میں کوئی اطلاع مجھے حاصل نہیں ہو سکی۔ چھان بین سے یہ تو معلوم ہو سکا کہ روزون قنوج کا رہنے والا تھا۔ وہاں اس کا ایک بھائی اور رہتا ہے لیکن وراثتی جائداد کو لے کر ان کے درمیان مقدمے بازی رہی اور روزون نے اپنا حصہ حاصل کر کے اس کو فروخت بھی کر دیا تھا۔ اب بھائی کے علاوہ کچھ بھی قنوج میں نہیں تھا۔

میں ہمیشہ بے جا کاروائی اور ظلم کرنے والے سے بچتا تھا مگر پولیس والا ہونے کے ناطے کہاں تک بچتا۔ ہاں اگر پتا چل جاتا مظلومیت کا تو اپنی غلطی تسلیم کرتا اور صحیح اقدام کرتا، نہیں تو عدالت تک پہنچا دیتا۔ جہاں میں پسند کیا جاتا ہوں وہیں میرے دشمن بھی ہیں۔ مجھ کو اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ اصل بات کیا ہے یعنی جرم کی وجہ کیا ہے؟ اور یہی بات مجھے اصل مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ میرا دل و دماغ روزون کی بوڑھی ماں کی جانب لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں اپنے کئی رفقاء لگا رکھے تھے کہ ہر حالت میں روزن کی بوڑھی ماں کا پتا لگایا جائے۔ زندہ یا مردہ دونوں صورتوں میں۔ کئی

دن بیت جانے کے بعد بھی مجھے روزون کی بوڑھی ماں کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں مل سکی تو میرا ذہن قنوج میں رہ رہے روزون کے بھائی سے ملنے کو ہوا۔ معلوم تو ہو کہ روزون کی بوڑھی ماں کس عقل وفکر کی مالک تھی اور میں اسکرون کے پاس قنوج پہنچ گیا۔ وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ اسکرون اسمیک کا عادی ہے، روزون کی بوڑھی ماں، روزون کی سگی ماں نہیں تھی، وہ تو اسکرون کی حقیقی ماں تھی۔ روزون کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ روزون کی سگی ماں مر چکی تھی۔ اسکرون کی گندی عادتوں کی وجہ سے اور اسمیک پینے کی وجہ سے وہ روزون کے ساتھ ہی رہتی تھیں مگر وہ بوڑھی ماں آخر ہے کہاں؟ رہ رہ کر میرے دماغ میں سوال گونج رہا تھا؟

کون سی وجوہات تھیں کہ بوڑھی ماں کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں لگ رہا تھا۔ اگر خود کو چھپائے ہوئے ہے تو کیوں؟

کافی دنوں بعد مجھے پتا چلا کہ جب پولیس والوں نے روزون کے مرجانے کی بات اس کی بوڑھی ماں کو بتائی تو لاش دیکھ کر ہائے ان کے منہ سے نکلا تھا اور صدمہ برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے وہیں در پر روح پرواز کر گئی۔ پولیس والوں نے روزون کی بوڑھی ماں کو بے نام فقیرن کا روپ دے کر گھاٹ پر جلوا دیا تھا۔ یہ بھی پتا چلا کہ بوڑھی ماں باباؤں اور فقیروں کے چکر میں پڑ کر دعائیں کرواتی اور منتیں مانتی کہ روزون کی طرح اسکرون بھی ٹھیک ہو جائے۔

لہو ہوتی تصویر

وہ سوچ وفکر کے دائرے میں الجھا ہوا جانے کب سے اندھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ آپ اپنے سے بے خبر...... اپنے ماحول سے بے خبر، اپنے مسائل اور زمانے کی پیچیدگیوں سے بے نیاز...... سوچ کے دائرے پھیلتے جا رہے تھے۔ اس کے چہرے اور پیشانی پر غم کی اتھاہ لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے آج کا تازہ اخبار کھلا پڑا تھا...... اور اس کی سرخی اس کے ذہن واحساس پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ امپھال کی پہاڑیوں سے ایک بوئنگ طیارہ ٹکرا کر گر گیا...... اور ۶۹ مسافر ہلاک ہو گئے ہیں!!

ایک طیارہ...... ۶۹ فرد...... ۶۹ کنبے...... ہزاروں چہروں کو آنسوؤں میں بھگو گئے......!! وہ قدرت کے اس مذاق کو کیا نام دے جس نے اس کی تمام آرزوئیں، تمام خواہشیں، تمام احساسات کو خاکستر کر دیا۔ اس کے سامنے اپنے معصوم بچے اور بیوی کا چہرا گھوم رہا تھا۔ معصوم ببلو، اس کی مسکراہٹ، اس کا ہنستا کھیلتا شاداب چہرا۔ کلکاریاں کرتا ہوا اور تتلی زبان میں ڈیڈی کہتا ہوا...... سب اس کے ذہن کے کینوس پر اُبھر آئے تھے...... کنول...... اس کی محبت کرنے والی وفادار بیوی...... اس کی زندگی کا محور، تمناؤں کا مرکز...... اور اس کے بے رنگ خوابوں میں رنگ بھرنے والی کہکشاں ...... سب زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ملبے میں دب کر رہ گئے تھے......!! اور وہ وسیع کائنات میں اپنے کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا......!

کل ہی کی تو بات ہے اس نے فون پر اس کی آواز سنی تھی، اس کی زندگی سے بھرپور آواز......! میں کل کی فلائٹ سے آ رہی ہوں۔ ننھا ببلو آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی آپ کو بھول نہیں پاتا ہے۔ پندرہ دن کا قیام میرے لیے سوہانِ روح ہو

گیا ہے۔اس نے مختصر سی گفتگو میں اپنے جذبات کا اس قدر اظہار کیا تھا کہ میں بے چین ہو گیا تھا کہ کنول میرے بغیر نہیں رہ سکتی ...... اور یہی کیفیت میری بھی تھی کہ میں کنول کے بغیر ایک لمحہ نہیں رہ سکتا تھا وہ میرے ساتھ اپنے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے گئی تھی۔ میں اپنی مصروفیت کے باعث شادی میں شرکت کر کے فوراً لوٹ آیا تھا...... اور کنول کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی اس لئے میں اسے چھوڑ آیا تھا.................۔

اسے کلکتہ چھوڑ تو آیا تھا لیکن یہاں اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا سب کچھ وہیں رہ گیا ہو۔ میرا دل میری روح میری دنیا۔ سب کچھ...... !شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب کنول مجھ سے اتنے عرصے کے لیے بچھڑی تھی اور پندرہ روز کا عرصہ کرب و بے چینی اور اذیت سے میں نے گزارا تھا۔اس کی گواہ میری راتیں اور میرے دن تھے......

شام کی سیاہی میرے کمرے میں بڑھتی جا رہی تھی اور میں اس در آتے گہرے اندھیرے سے بے خبر اپنی ذات میں اترتی ہوئی سیاہی کے غار میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اخبار کا پہلا صفحہ...... جلی حروف کی سرخی ...... میری زندگی کو زخمی کر رہی تھی ,لہولہان کر رہی تھی۔ ایسا المیہ جس نے میری روح کے تانے بانے بکھیر دیئے تھے...... اور سارا اخبار لہو میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں اور میں سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا......

لیکن خیالوں کے پرندے...... مجھے کئی سال پیچھے اڑا کر لے گئے جب میری کنول سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات میں نینی تال کے ایک خوبصورت ہوٹل کے ہال میں وہ اچانک میری میز سے ٹکرا کر لڑکھڑاتے ہوئے گرنے لگی تھی ،اور میں نے اسے سنبھال لیا تھا گھبراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے پر حیا آلود مسکراہٹ نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ خود تو سنبھل گئی تھی لیکن میں اپنے کو سنبھال نہ پایا تھا۔ کسے خبر تھی یہ مختصر ملاقات...... زندگی بھر کے ساتھ میں بدل جائے گی ......

نینی تال کا حسن اور اس کی خوبصورتی میں جب کنول کا ساتھ ہوا تو وہاں کا ذرہ ذرہ اور بھی حسین و جمیل محسوس ہونے لگا...... جلد ہی ہم ایک دوسرے کی ضرورت

بن گئے۔ اور پھر واپس آ کر میں نے اسے اپنا لیا۔

کنول کا شریکِ زندگی ہونا۔ میرے دل کے آنگن میں مہکنا...... میں ایک خوشگوار حادثہ تصور کرتا ہوں۔ اور واقعی کنول نے اپنی تمام تر چاہتیں میری جھولی میں ڈال دیں۔ میں زندگی کے خواب زار جزیرے میں کھو کر سب کچھ بھول چکا تھا۔ اپنی مصروفیت، اپنا کاروبار...... پھر کنول نے مجھے ذمہ داری کا احساس دلایا اور میں کام میں دل چسپی لینے لگا۔

وقت پرندے کی طرح اڑتا رہا اور دو سال بعد ببلو میرے گھر کے آنگن میں پھول کی طرح مہک اٹھا۔ زندگی اور بھی حسین لگنے لگی...... اور زندگی کے یہ تابناک اور پر بہار لمحے گزرتے رہے۔

لیکن آج اس منحوس خبر نے میرے تمام خواب چکنا چور کر دئے تھے اور زندگی کے اندھیرے میں کنول کی ہنسی اور معصوم ببلو کی مسکراہٹ تلاش کر رہا تھا لیکن ہر طرف ایک گہری تاریکی، بیکراں سناٹا، ویران سائے، ٹوٹتے بکھرتے لمحوں کی جان لیوا کسک ...... کھڑکی سے آتی ہوئی وحشت ناک ہوا کی سرگوشیاں۔!

تم کیا ہو...... کچھ بھی نہیں؟

تم کون ہو...... کچھ بھی نہیں؟

تمہارا کیا ہے...... کچھ بھی نہیں؟

تمہارا سب کچھ ختم ہو گیا...... یہ لافانی اندھیرے ہی اب تمہاری میراث ہیں۔ یہ تنہائیاں، یہ سناٹے...... یہ سنسان بنگلہ...... تمہاری روح میں کراہوں کی چنگاریاں بھر دیں گے۔ ہا۔ ہاہا۔ ہا...... ایک وحشت ناک قہقہہ...... مجھے اپنے دل و دماغ میں گونجتا ہوا محسوس ہوا چھوڑ دو مجھے...... تنہا چھوڑ دو...... اور میں تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیتا ہوں۔

تبھی کمرے میں ایک جھنکار گونجتی ہے...... اور فرش پر ایک تصویر گر کر بکھر جاتی ہے...... یہ تصویر میری اپنی شادی کی یادگار تھی جس میں کنول میرے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میرے ہاتھ تیزی سے اس تصویر کو اٹھانے کے لیے بڑھتے ہیں لیکن کرچوں سے ٹکرا کر میرے ہاتھ لہولہان ہو جاتے ہیں اور تصویر، خون میں نہا جاتی ہے۔ ☆☆

فضائے بے اماں

میں کچھ اس طرح سے بھاگا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ جہاں زندگی کا وجود کوئی معنی نہ رکھتا ہو، وہاں اگر جان بچ رہی ہو تو بھاگنا بزدلی نہیں۔

جہاں میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہوں، وہاں شریف اور خود پسند طبقہ کے افراد رہتے ہیں، کسی کو ایک دوسرے سے کوئی مطلب نہیں۔ سب اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہیں۔ میں بھی سکون پسند ذہنیت کا مارا ہوا فرد ہوں۔ دفتر، دوستوں اور تفریحی معاملات میں مگن، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ دوسرا کیا کر رہا ہے؟ کیا سوچ رہا ہے اور ملکی حالات کیسے ہیں؟

بین الاقوامی سطح پر سیاسی اور سماجی حالات کیا ہیں؟

ان سے بے خبر، اپنے آپ میں مست، آخر کیوں نہ عیش کروں۔ پیسہ میرے پاس، رتبہ میرے پاس، شادی کا جنجال میرے پاس ہے نہیں۔ ہاں؟ میں ایک پرکشش شخصیت کا ضرور مالک ہوں، میرے جال میں بہت سی چڑیاں پھنسیں اور میں نے جو چاہا وہ کیا بھی۔

یہ بھی سچ ہے کہ جہاں میں اس سے پہلے رہتا تھا وہاں شور بہت تھا، گندگی بے حد تھی اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی، مفت کے مشورے اور ہمدردیاں مل جانا عام بات تھی۔ لوگوں کے پاس فالتو وقت بہت تھا۔ صبح کو زور زور سے اخبارات پڑھتے ہوئے اور چائے پیتے ہوئے لوگ۔ امریکہ، روس، لندن، ایران، عراق، کشمیر، فلسطین، اسرائیل، چین، اسامہ بن لادن کی حمایت اور مخالفت میں بحثیں

کرتے، مالک پر الجھتے، کام کرتے ہوئے بچے اور شراب پیتے ہوئے لوگ۔ تقریریں، میوزکل نائٹ پروگرام اور گلے باز شعراء کو دیکھتے سنتے ہوئے ہجوم، لڑتی ہوئی عورتیں، تعلیم کی طرف کم رجحان لیکن فیشن پرستی عیاں........اوب چکا تھا میں..........یہ گندگی اور ماحول دیکھ کر۔ ذہنی پستی کا یہ عالم کہ کوئی بھی چھینٹا کشی سے محفوظ نہیں، لڑکے، لڑکیاں، بوڑھے اپنے اپنے درجات میں رنگینی کیفیت سے ہمکنار اور حدیں بھی پار ہوتے ہوئے میں نے اکثر خود دیکھا۔ بدمزگی کا احساس مجھ پر بھی رہتا مگر میں کیا کروں؟ مجھ سے کیا مطلب؟ یہ سوچ کر میں خود کو سمجھا لیا کرتا تھا کہ وہ خوش نصیب دن جلد آئے گا کہ جب میں یہاں نہ رہ کر کسی پرسکون جگہ پر رہنے لگوں گا۔ کافی جدوجہد کے بعد میں اب پرسکوں جگہ پر رہ رہا ہوں۔ جہاں ہریالی ہے، صفائی ہے اور بہترین سڑکیں ہیں، بجلی ہمہ وقت رہتی ہے، شور کا تو نام ونشان بھی نہیں، میں مطمئن ہوں اور تازگی محسوس کرتا ہوں۔

ہاں پچھلے دنوں قریب کے فلیٹ پر ہوئے حادثے کو جان کر میں اندر تک لرز اٹھا تھا۔ ڈاکٹر شرما کو بدمعاشوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور سارا روپیہ پیسہ زیورات لوٹ کر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر شرما شہر کے معروف سرجن تھے اور ملنساری میں اپنا جوڑ نہیں رکھتے تھے۔ روز تقریباً سو افراد دیکھتے اور دو سو روپیہ فی فرد فیس لیتے تھے دس آپریشن کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی ایک پوری ٹیم تھی ان کے پاس، ڈاکٹر شرما کی بیوی ان دنوں امریکہ میں تھیں، صرف ایک لڑکی تھی جوان دنوں مصر میں اپنے منگیتر کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ کچھ دنوں بعد یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر شرما کی موت اور لوٹ میں ان کا وفادار نوکر ملوث تھا۔ پولیس نے کچھ روپیہ اور وہ چھری بھی برآمد کر لی تھی جس سے ڈاکٹر شرما کو بڑی بے دردی کے ساتھ ذبح کیا گیا تھا۔

اور پھر پرسکون علاقے کا حشر دھیرے دھیرے اور خراب ہوتا چلا گیا۔ آئے دن وارادات، ہنگامے، لوٹ، اغوا اور ریپ کی خبریں.....دہشت کا ایک ماحول بن چکا

تھا۔ پرسکون علاقے، باہر سے تو پرسکون نظر آتے ہیں لیکن اندر سے نہیں تھے، حفاظتی گارڈ پہلے بھی تھے مگر اب اور بھی شاطر قسم کے آگئے تھے۔ ذہنوں میں ڈر چپکے چپکے داخل ہو چکا تھا کہ اب کہاں رہائش اختیار کی جائے۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورے بھی کیے، دفتر میں بات چیت بھی کی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا۔ غیر محفوظیت کا اندیشہ مجھ پر حاوی ہونے لگا تھا اور میں پریشان اس قدر ہو گیا کہ شک کی بنیاد پر اپنے گھر پر کام کرنے والے نوکر کو نکال دیا.........جبکہ نوکر میرا اپنا جانا اور پرکھا ہوا تھا۔ ان حالات میں میں اپنا سکون چین اور کھو بیٹھا کیوں کہ گھر کی دیکھ بھال، کھانا وغیرہ سب بے ترتیبی کا شکار ہو گیا تھا۔

میں کیا کروں؟.........کس طرح اپنی گاڑی کو پٹری پر لاؤں سوچا کرتا، سوچا کرتا...............پھر میں اپنے نکالے ہوئے نوکر کو رکھ لیتا، اور کچھ راحت کا احساس کرتا ہوں، مگر اب یہ پرسکون جگہ مجھے ہر وقت کاٹنے کو دوڑتی رہتی ہے۔ ذہن لایعنی باتوں میں بھٹکتا رہتا.............یہ ہو رہا ہو گا وہ ہو جائے گا مگر ہوتا کچھ نہیں تھا..........وارداتیں کم ہونے کے بجائے بڑھ ہی رہی تھیں اس سے میرا ہی نہیں اور دیگر رہنے والوں کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا اور وہ سرکار پر دباؤ بنانے میں متحد ہونے کی سوچنے لگے مگر ہمارا تو جوتا نوفٹ کا ہے اس سوچ نے ان کو کچھ بھی کرنے نہیں دیا۔ ہاں، الگ الگ یہ سبھی شور مچا رہے تھے مگر میں ان باتوں کو فضول سمجھتا ہوں۔ میں کیوں درد مول لوں؟ مجھے یہاں نہیں رہنا ہے۔ جلد از جلد اور کوئی جگہ تلاش کرنا ہے۔ دل و دماغ ان ہی باتوں میں لگے رہتے۔

اور میں نے آخر کار فیصلہ کر ہی لیا کہ مجھے ایسی جگہ رہنا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتی ہو یعنی خوب چہل پہل اور ہر وقت جاگتی ہوئی شاہراہ پر مکان تلاش کر کے میں وہیں رہوں گا۔ جدید ترین آلات کا استعمال کر کے میں اپنی رہائش کو سجا لوں گا پھر میری پریشانی ختم ہو جائے گی اور مجھے سکون مل جائے گا۔ اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے جاگتی ہوئی شاہراہ پر ایک عمارت کی پانچویں منزل پر فلیٹ کرائے پر مل گیا۔

میری روزمرہ کی مفلوج زندگی میں نکھار آ گیا اور عیش کی بنسی بجنے لگی۔ میں اس وقت جس جگہ رہ رہا ہوں، وہاں رات کے دو بجے بھی دن کی سی رونق رہتی ہے، آدمیوں کا اژدہام ہر وقت ادھر ادھر جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کاریں، بائیسکل، اسکوٹرس، پیدل اور بسوں، ٹیکسیوں وغیرہ کی ہمہ وقت ریل پیل رہتی ہے، رش کبھی کم نہیں ہوتا۔

میں اپنے فلیٹ پر پہنچ کر بے فکر ہو جاتا اور شور ہونے کے باوجود بھی مجھ تک پہنچتا نہیں تھا، کچھ مہینے تو بہت سکون آرام سے گزرے کہ ایک دن جب میں دس بجے دن میں آفس جانے کو فلیٹ سے نکل رہا تھا تو جاگتی ہوئی شاہراہ پر آمد و رفت منجمد تھی۔ اور چہروں پر میں نے بے چینی و بے کلی محسوس کی، میں اپنے آفس کس طرح جاؤں، میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ سارے راستوں پر انسانی ہجوم امنڈ اپڑ رہا تھا۔ ہر چہرا یہ سوال لیے ہوئے تھا کہ آخر یہ انسانی ہجوم بڑھ کیوں نہیں رہا ہے؟ آگے کیا ہو رہا ہے؟ ہر فرد مضطرب اور بے چین، وہ یہ بات جاننا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہو رہا ہے؟ وقت گذر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے...............اور پھر کیفیت کا پرندہ یہ بتا رہا تھا کہ آگے ایک سبھا ہو رہی ہے جس میں ترشول بانٹے جا رہے ہیں، تقریریں، آگ برساتی تقریریں کرتے ہوئے شریف لوگ انسانوں کو مذہب، زبان کے نام پر بانٹ رہے تھے۔ کئی گھنٹے تک یہ رش اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں کھسکا، ہجوم میں بڑھتا اضطراب، دیر سے پہنچنے کی جھنجھلاہٹ، کچہری میں پیشی، آفس و کارخانوں، دوکانوں کی دیری، ہاسپٹل، اسکول کالج اور کام کی دیری، گھر اور انجانے حالات کی سوچ -غرض کہ دیر ہی دیر، سوچ ہی سوچ اور میں ایک جانب کھڑا ہوا یہ سب منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی تو آفس جانا ہے۔ میں نے فون کر کے آفس کو ساری باتیں بتا دی تھیں کہ میں جام میں پھنس گیا ہوں، آفس جانے کے سارے راستے مسدود ہیں اور ان پر انسانی ہجوم کا قبضہ ہے اور یہ سب ترشول بانٹنے کے پروگرام کی دین ہے۔

ترشول بانٹنے کے پروگرام کو میں نے غور سے سمجھا تو ایسا لگا کہ فضا میں تناؤ کے جراثیم شامل ہو چکے ہیں اور کسی بھی وقت جذبات کا سیلاب انسانوں کے درمیان

آ کر اپنی تباہی و بربادی کی داستان چھوڑ جائے گا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آ ہی رہا تھا کہ نعروں کی یلغار شروع ہوگئی لوگ دہشت میں ادھر اُدھر بکھرنے لگے، افراتفری کا بھیانک ترین کارنامہ یہ تھا کہ وہ خود کو بھول کر ایک دوسرے کو گراتے ہوئے بھاگ رہے تھے، کون کہاں ہے؟ اس سے بے خبر صرف خود کو محفوظ دیکھنا چاہتے تھے، مار کاٹ، لوٹ پاٹ، دھماکے اور فائرنگ شروع ہو چکی تھی، شاہراہ پر لہو اور انسان بکھرے پڑے تھے، دوکانیں شعلوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

زندگی خود سے شرمندہ، انسانوں پر آنسو بہا رہی تھی، انسان، انسان کو مار رہا تھا، برباد کر رہا تھا۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی تمیز باقی نہ تھی اور نہ ہی رحم کا جذبہ۔ مال واسباب اور عصمتیں لٹ رہی تھیں، مرتے ہوئے افراد چیخ و پکار رہے تھے، کوئی بھی سننے والا نہیں تھا، بے حسی چھائی ہوئی تھی، سارے ادارے خاموش.......... جاگتی شاہراہ، لاشوں کی شاہراہ بن چکی تھی، جس پر موت رقص کر رہی تھی، ....اور میں...... یہ سب دیکھ کر بھاگ رہا تھا بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ اس سے بے خبر کہ کہیں کوئی جائے امان بھی ہے۔

بہتان

رحمان سائیکل تیزی سے چلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا کہ اچانک ہی ایک برق رفتار کار اس پر چڑھ دوڑی۔ رحمان کا جسم ایک بارگی اکڑا اور فوراً ہی ساکت ہو گیا۔

ارے۔ ارے یہ کیا ہو گیا؟ کار والے کو پکڑو۔ پکڑو جانے نہ پائے مگر کار یہ جا وہ جا اور کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ بے چارہ مر گیا۔ خدا جانے کس کا لال تھا۔ ایک ہمدردیوں کا بازار ذرا دیر میں اکٹھا ہوا اور فوراً ہی ختم ہو گیا کیونکہ پولیس سائرن سُنائی دینے لگا تھا۔

کافی تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ رحمان نام کا یہ آدمی شہر کی گھنی بستی میں رہتا تھا اور اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں نے جب یہ سُنا کہ اس کا بیٹا رحمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ایک حادثہ میں اس کی جان چلی گئی، اتنا سُن کر اس کی ماں بھی مالک حقیقی سے جا ملی۔ جس نے بھی یہ المناک بات سنی۔ اس نے افسوس ظاہر کیا۔ بیچاری اپنے بیٹے کو کس قدر چاہتی تھی۔

ابھی کل کی ہی تو بات تھی۔ جب رحمان محال کے دوستوں کے ساتھ کیسا بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ارادے بلند اور حوصلے جوان تھے۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ کیمسٹری میں پاس کرنے کے بعد وہ اپنے قرب و جوار میں اپنی الگ پہچان بنا چکا تھا، جگہ جگہ اور گلی گلی میں صرف اس بات کا ہی چرچا تھا کہ ارے اس بڑھیا کا بیٹا ایم۔ ایس۔ سی۔ کیمسٹری میں ٹاپ ہوا ہے۔ یہ بھئی۔ کیمسٹری کیا ہوتی ہے؟ عجیب سوالات گونج رہے تھے۔ رحمان کی بڑی عزت تھی۔ وہ گھنی بستی میں ایک ایسی شخصیت رکھتا تھا جو کہ مافوق

الفطرت سمجھی جاتی تھی۔ رحمان کا جگری دوست عارف جو کہ اس کا دودھ بھائی بن چکا تھا۔ ایک دوسرے سے ازحد محبت کرتے تھے۔ پڑھنے کے اوقات میں رحمان کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن جب عارف آجاتا تھا تو وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی۔ اکثر شام کو وہ دونوں اکٹھا ہوکر قریب کی پارک میں جو پورے علاقے میں ایک ہی بچی تھی، باقی پر لوگوں نے قبضہ کر کے مکانات تعمیر کروالئے تھے۔ گھنٹوں بیٹھے زندگی کے نشیب وفراز کی باتیں کیا کرتے تھے کبھی کبھی بحث بھی تکرار کے ساتھ ہو جایا کرتی تھی لیکن کل پھر ایک ہوکر پڑھ رہے ہیں گھوم رہے ہیں۔

عارف کی ماں بچپن میں ہی مر چکی تھی ۔ ماں کی محبت کا عارف بھوکا تھا۔ رحمان کی ماں عارف کو اپنا دوسرا بیٹا کہتی اور سمجھتی تھیں جبکہ عارف کا باپ رحمان کے گھر آنے جانے اور ساتھ گھومنے پر اعتراض کرتا تھا اور لوگوں سے کہتا تھا کہ یہ سب ڈھونگ رچتے ہیں۔ میرے بیٹے کو بیوقوف بنا کر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کا پیسہ مارتے ہیں۔ عارف سے محبت نہیں ان کو عارف کے پیسوں سے پیار ہے مگر یہ بات بالکل غلط تھی۔ رحمان نے اور اس کی ماں نے عارف سے کبھی بھی پیسوں کی کوئی بات پوچھی اور نہ ہی کہی بلکہ عارف جب پہنچتا تھا تو وہ کیا کھلا دیں کیا پلا دیں۔ رحمان کی ماں کو خود ہی اتنی پینشن ملتی تھی اور اس کے ساتھ ان کے شوہر کی چھوڑی ہوئی جائداد سے بھی اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ کل ملا کر ان کی گھریلو زندگی خوش حال تھی۔ زندگی میں پریشانی نام کی کوئی چیز نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ رحمان کو پڑھنے لکھنے کی پوری چھوٹ تھی۔ رحمان تھا بھی بلند ذہن۔ ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ ایس۔ سی۔ تک وہ فرسٹ کلاس ہی آیا۔ اس کے پاس تحفے بھرے ہوئے تھے، جنھیں وہ اکثر اپنے دوستوں کو دکھاتا تھا۔

رحمان اور عارف میں کبھی کبھی اس بات پر بحث ہوتی تھی کہ کون سائنسداں بنے گا؟ رحمان کہتا میں، عارف کہتا میں، حجت اور دلیل دونوں پیش کرتے۔ ایسا نہیں کہ عارف رحمان سے کم تھا۔ لیکن ہر حال میں رحمان ہی بازی مار لے جاتا۔ عارف رحمان کی کامیابی پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا۔ رحمان بھی عارف کی

خواہشوں وتمناؤں کی قدر کرتا۔ عارف کے بنائے ہوئے نوٹس، رحمان کو کافی مدد دیتے تھے مگر اتنا ہونے کے باوجود بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے پوائنٹس چھپاتے تھے کیونکہ معاملہ ٹاپر ہونے کا جو تھا۔

رحمان کی ماں کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا ایک بہترین ڈاکٹر بنے کیونکہ اس کا شوہر بھی ڈاکٹر تھا۔ رحمان کی ماں اپنے شوہر کی بہت ہی اطاعت گزار بیوی تھیں۔ جب رحمان پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناؤنگی، اس وقت اس کے شوہر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ تم اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہو لیکن یہ بڑا ہو کر کیا بننا چاہے گا۔ میرے بچے کے اوپر اپنی خواہش مت لادنا جو یہ چاہے وہی کرنے دینا؟

جب بھی رحمان کی ماں رحمان سے ڈاکٹر بننے کی بات کرتیں تو فوراً رحمان کہتا نہیں ماں، میں سائنس داں بنوں گا۔ سائنس داں بنوں گا اور اس کی ماں اپنے شوہر کی بات سوچتی اور کہتی کہ سائنس داں کیا ڈاکٹر نہیں ہوتے؟ لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا رحمان کی خواہش اب عارف کی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا تھی اب تو اس کے خواب وخیال میں صرف ایک ہی بات ناچتی رہتی تھی کی اب اسے سائنس داں بننا ہے کیونکہ اس کے دوست رحمان کی تمنا تھی اور اپنی ساری کاوش لگا دینے کے باوجود بھی عارف اپنے دوست رحمان کی خواہش پوری نہ کر سکا کیونکہ عارف کا باپ اپنی دولت کو اور بڑھانے کے چکر میں بزنس مین بننے کے لئے مجبور کر رہا تھا اور عارف آخر کار بن ہی گیا بزنس مین۔

عارف سونے سے پہلے کتاب پڑھنے کا آج بھی عادی تھا بغیر پڑھے اس کو نیند قطعی نہیں آتی تھی۔ وہ کتاب کی ان سطور کو پڑھ کر چونک پڑا اور اس کا وجود مانو خلاء میں تیر رہا ہو۔ جذبات اور احساسات سے خالی۔ لکھا تھا۔

"بدقسمتی محض بہتان ہے جو کاہلوں کی طرف سے خدا پر لگایا جاتا ہے۔"

☆☆

شور

اس کا ذہن برق کی طرح دوڑ رہا تھا مگر جذبات برف کی مانند سرد تھے کیونکہ وہ نکلا تھا کمانے کی چاہ لے کر لیکن مذاق...... بھیانک مذاق، حادثہ..... بدترین حادثہ، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کو کیا نام دیا جائے؟

چھوٹا سا گاؤں، جہاں اسکا بچپن بیتا اور خواب دیکھتے دیکھتے وہ قصبے میں آ گیا تھا۔ قصبے سے شہر میں اور پھر میٹروپولیٹن شہر میں قسمت آزمانے پہنچ گیا اور زمانے کے نشیب وفراز نے اس کو بہت کچھ دکھا دیا تھا۔

دنیا کے ترقی یافتہ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ بچوں سے ان کا بچپن مت چھینو، کام مت کراوٗ، ان کو تعلیم دو، کتابیں دو۔ ہمارے یہاں بھی اس طرح کا راگ، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں الاپا جا رہا ہے، اس نے پہلی بار جب سنا کہ بچوں کو کام نہیں، کتابیں دو تو وہ کافی دیر تک ان الفاظ کے مطلب نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر کار اس نے اپنے دوکان دار، جہاں وہ چائے کے جھوٹے کپ پلیٹ دھونے کا کام کرتا تھا، سے پوچھنے لگا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو دوکاندار نے جواب دیا۔ ابے یہ سب بیوقوف بنانے کی باتیں ہیں۔ سالے، بلا رشوت لئے کوئی کام نہیں کرتے اور چلے ہیں غریب، بے سہارا، معذور بچوں کو مفت کتابیں دینے اور پڑھانے۔ چل تو اپنا کام کر، کھڑا کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ وہ پھر کپ پلیٹ دھونے میں لگ گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کام نہیں کرے گا تو سیٹھ اس کو کھانا نہیں دے گا اور مارے گا الگ سے۔

جب وہ قصبے سے بھاگ کر شہر میں آیا تو بہت خوش تھا۔ چلو، کپ پلیٹ

دھونے سے نجات تو ملی مگر یہ خوشی دوسرے دن ہی کافور ہوگئی تھی جب اس کو بھوک لگی، ریلوے اسٹیشن پر رات گزاری اور اتنی گہری نیند آئی کہ جو کچھ بھی اس کے پاس تھا سب بھائی لوگ اٹھالے گئے۔ شکر اس بات کا تھا کہ وہ کسی گروہ کے ہتھے نہیں چڑھا ورنہ وہ مفلوج کر کے اس سے بھیک منگوانے کا پیشہ کرواتے۔ یہ حسن اتفاق ہی تھا جب وہ مارے بھوک کے رونے ہی والا تھا کہ ایک قلی کو اس پر رحم آ گیا اور قلی پوچھ بیٹھا کہ تو کون ہے؟ تیرے چہرے پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ تو وہ بولا کہ اس کا نام قیوم ہے، میرا سارا پیسہ، کپڑا، سب کسی نے سوتے وقت چرالیا۔ مجھے شدت کی بھوک لگی ہے۔ لیکن تو یہاں کیوں آیا؟ قلی نے پوچھا تو اس نے برجستہ جواب دیا، پیسہ کمانے۔ قلی یہ سن کر بڑی زور سے ہنسا، پیسہ کمانے، اب اپنی عمر دیکھی ہے، تو تو ابھی ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوسکتا ہے، اور چلا ہے پیسہ کمانے، قلی نے اللہ جانے اس میں کیا دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھلایا پھر وہ وہیں رہنے لگا۔ جھاڑو برتن اور سودا سلف وغیرہ لانے لگا۔ قلی کی تین لڑکیاں اور ایک بیوی تھی، لڑکیاں تینوں پڑھ رہی تھیں، لڑکیاں بہت اچھی اور نیک تھیں، انہوں نے اس کو نام لکھنا سکھا دیا اور کچھ پڑھنا بھی مگر اللہ کی پناہ۔ قلی کی بیوی آگ تھی آگ، قلی اور اس کی لڑکیاں جب گھر پر نہیں ہوتی تھیں تو وہ اس سے اپنے سارے بدن میں تیل لگواتی اور مالش کراتی، انکار کی صورت میں مارتی اور بھوکا رکھتی تھی۔ قلی اور لڑکیوں کا خلوص اس کو باندھے رکھتا ورنہ وہ تو ایک منٹ بھی رکنا گوارا نہیں کرتا۔ اس کی رنجیں اب بھیگ چکی تھیں، قلی کی بیوی جس کو وہ اپنی ماں کے روپ میں دیکھتا تھا سمجھتا تھا لیکن اس کی عادتوں حرکتوں سے وہ اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ ایک دن سارے محبت بھرے ناطے کو توڑ کر بھاگ نکلا۔ ایک ایسی مہانگری میں جو ہوش و حواس کو گم کردے، وہاں کا رہن سہن، چال اور رنگ ڈھنگ اس کے وہم و گمان سے بالاتر تھے، وہاں کوئی کسی کا نہیں، سب کو پیسہ چاہئے، پیسہ، پیسہ ایک دوسرے کو پیچھے کرتے ہوئے، روندتے ہوئے، شرم و حیا کو ختم کرتے ہوئے، کامیابی کی چاہ میں سب کچھ بیچتے اور خریدتے ہوئے مرے جا رہے تھے،

آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک نے دل و دماغ، جذبات و احساسات و معاملات کو تجارتی بنا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بھی ایک علاقائی دادا کے چکر میں آ گیا تھا۔ وہ خوبصورت تو تھا ہی، دادا کی پارکھی نگاہوں نے اس کو پسند کر کے، اس کے لئے کام بھی سوچ لیا، دادا نے اس کو کھانا اور بہترین کپڑے مہیا کرائے، غرض کہ وہ ہر چیز اس کو دی جو اس کی خوبصورتی کو اور نکھار دے۔ وہ یہ سب پا کر بہت خوش ہوا مگر اس کے بعد تو وہ دادا کے چکر میں گھومتا ہی چلا گیا۔ جب ایک دن دادا نے اس کو بلا کر کہا کہ اب تو دھندے کے لیے پوری طرح سے فٹ ہو چکا ہے اور تجھے آج شام سے ہی کام شروع کر دینا ہو گا؟ پھر اس نے دادا سے پوچھا کہ اس کو کیا کرنا ہو گا؟ دادا نے بتایا کہ تیری اس کے ساتھ بکنگ ہو چکی ہے، اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہاں میک اپ سے لپی پتی ایک چوڑے بدن کی ادھیڑ عورت موجود تھی جو اس کو بڑی دل آویز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر شرارت رقص کر رہی تھی، اس نے دادا سے پھر پوچھا کہ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا ہو گا؟ اس پر دادا نے برا سا منھ بنا کر کہا کہ سالا تو نوجوان کیوں ہے؟ یہ تجھے سب بتا دے گی کہ تجھے کیا کیا کرنا ہو گا؟

وہ کئی سال تک دادا کے چنگل میں پھنس کر اپنی نوجوانی کھوکھلی کر کے پیسہ کماتا رہا۔ اس نے دادا کے کئی رنگ روپ دیکھے تھے، ایک تو اس کے جیسے اور کئی خوبرو نوجوان تھے، دوسرے دادا کے پاس اچھی خاصی تعداد میں کمسن اور تندرست لڑکے تھے جو بوڑھے اور جوان مردوں کی ہوس کا شکار بن کر پیسہ کماتے تھے، تیسرے وہ حسینائیں تھیں جو اپنے عاشقوں کے چکروں میں اپنے گھروں سے بھاگ کر کچھ کر دکھانے کا جذبہ لے کر آتی تھیں اور رہتے شباب تک خود کو بیچتے ہوئے پیسہ کمانے کے مرض میں مبتلا ہو کر آخر میں بھیک مانگ کر روٹی حاصل کرتیں، اس میں بھی دادا کا حصہ ہوتا تھا۔ دادا کو ہر حال میں پیسہ چاہئے تھا۔ بے چارے کو ہر جگہ پیسہ دینا بھی پڑتا تھا۔

وہ اس دھندے میں ایسا پھنسا کہ اس کو اپنا بچپن، گاؤں، کھیت، ماں جو اس

کو جنم دیتے ہی مر گئی تھی، باپ جس نے دوسری شادی رچا کر اس کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ہو گاؤں کے پردھان کا جس نے ترس کھا کر اپنے یہاں رکھ لیا تھا مگر اس کو پالنا نہیں کہا جا سکتا تھا وہ تو نوکر سے بھی بدتر تھا۔ پردھان چاچا کو چناوی رنجش میں مار دیا گیا تھا۔ پانچ لاشیں دیکھ کر گاؤں والے حیرت کر رہے تھے کہ یہ کیسے بچ گیا تھا۔ وہ معصوم اور ناسمجھ بچہ تھا، بے سہارا بھی، چائے کی دوکان پر کپ پلیٹ دھونے کب آ گیا تھا، اس کو یاد نہیں بالکل یاد نہیں۔

رفتہ رفتہ اس نے حالات کو سمجھا اور ساتھ ہی اپنی حیثیت کو بھی۔ اب وہ پڑھنا لکھنا سیکھ چکا تھا۔ اخبارات، ٹی وی چینل اور انٹرنیٹ پر اس نے اکیسویں صدی کا شور دیکھا اور پڑھا۔ نئے عہد و پیماں کے تانے بانے سجائے جا رہے تھے۔ اکیسویں صدی کی حالت اور صورت پر مفکرین حضرات اپنے اپنے خیالات کا اظہار و اقرار کر رہے تھے مگر وہ ان سب سے ہٹ کر اپنے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کا حشر کیا ہوگا؟ وہ دنیا کو سوائے نفرت کے اور کیا دے پایا مگر سچ یہ تھا کہ وہ آج بھی خلوص اور محبت کا بھوکا تھا۔ کیا یہ شور اس کی بھوک کو کوئی نیا آہنگ دے سکے گا یا یونہی رنگ و روپ بدلتے رہیں گے۔

کہانی - ایک اور......

ایک ضعیف العمر لاٹھی کے سہارے کھڑا تھا، اس کے سر پر گول ٹوپی اور چہرے پر بھرپور داڑھی تھی۔ لمبا کرتا، اونچی تہبند اور پیروں میں ہوائی چپلیں، بے رونق جسم اور چہرے سے بلا کا کرب نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو حاملہ جوان خاتون تھیں، اس کے چہرے پر بھی رنج والم ظاہر تھا، خاموش دونوں تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی ایک بند گاڑی انہیں اسی شاہراہ پر اتار گئی تھی۔ سائرن بجاتی ہوئی ایک تیز رفتار گاڑی، جہاں ضعیف العمر اور حاملہ خاتون کھڑے تھے۔ یہ شاہراہ دو صوبوں کو جوڑتی ہوئی اپنی ہریالی کے لئے مشہور اور ہیروں کی کان کہی جاتی مگر اس وقت شعلوں کی تمازت نے اس کے چہرے پر چیچک کی بدصورتی چسپاں کر دی تھی۔

ضعیف العمر نے اپنی عمر بیاسی سال کی بتائی اور خاتون کی بیس سال۔ جنگ آزادی میں اس ضعیف العمر کا بڑا ہاتھ تھا۔ جیل کی مشقتیں، برطانوی حکومت کی دوغلی پالیسیاں اور ان سے لڑنا۔ ملک کی آزادی اس کا نصب العین تھا۔ آزادی کے رہنماؤں کی اپیل پر اس نے اپنی تعلیم چھوڑ دی اور ملک کی آزادی کی جنگ میں شریک ہو کر اپنا سب کچھ ملک کے لئے قربان کر دیا تھا۔ انگنت قربانیوں کے صدقے میں ملک آزاد ہوا۔ ملک کے بٹوارے کی اس نے شدید تر مخالفت کی اور ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا۔ بڑی جدوجہد کے بعد اس نے اپنا ایک کاروبار شروع کیا۔ کپڑوں کی تجارت خوب پھولی پھلی۔ اسکے یہاں ایک لڑکا ہوا۔ آزادی ملنے کے بعد ہی اس نے شادی کی

تھی اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اوروں کی طرح وہ بھی اپنا کردار نبھانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ بہت بڑے کاروبار کا مالک بن چکا تھا۔ دولت و شہرت کے ساتھ ساتھ وہ چار پوتوں کا دادا بھی بن گیا تھا۔ اپنی کھیتی، اپنی فصل دیکھ دیکھ کر از حد خوش تھا اور پروردگار کا شکر بھی ادا کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے سبھی پوتے جوان ہو گئے۔ اب وہ برائے نام ہی کاروبار کو دیکھتا تھا۔ زیادہ تر مسجد میں یا پھر اللہ کی راہ میں نکل کر مخلوق خدا کو دعوتِ حق کا پیغام دیتا۔

ملکی فضا میں گرد و غبار اور کبھی کبھی بدلی کا احساس بھی اس کا ضعیف ذہن محسوس کرتا۔ باتیں نفرت کی، صوبہ پرستی انسانی افضلیت اور فرقہ وارانہ منافرت کی فصلیں۔ جس پر اس نے ہمیشہ لعنت بھیجی تھی، اس کے سامنے ہی بڑھتی ہوئی نظر آئیں، اس کی رفتار کو دیکھ کر وہ کبھی کبھی دہل اٹھتا تھا۔ ہر سال ایک نئی پود مذہبی تشدد کے پیکر میں ڈھلتی ہوئی ''مذہب کے نام پر بابر کی اولادیں ہم برداشت نہیں کریں گے''۔ دیوی دیوتاؤں کا احترام لازم ہوگا۔ یہ بات ہم لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جن کے طور طریقے ہم سے جدا ہیں فضا میں دھیرے دھیرے زہر کی مقدار بڑھ رہی تھی۔ جذبات کو کون روک سکا ہے جب افواہیں مددگار ہوں...... فساد...... فرقہ وارانہ فساد ...... پولیس ایکشن...... ایک سلسلہ شروع ہو چکا تباہی و بربادی کا...... قتل و غارت گری کا...... مسلمان رہتا تو ہندوستان میں مگر باتیں کرتا ہے پاکستان کی۔ ایک الزام تھا جو فرقہ پرستوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ پھر اس کے بعد الزامات کی فہرست مسلمانوں پر تھوپ دی گئی۔

مسلمان اور غدار...... یہ کسی بھی صورت میں ممکن ہی نہیں، ایک نہیں۔ لاتعداد بار دی گئیں قربانیاں اس کا بین ثبوت ہیں۔

ضعیف العمر کو امن و آشتی اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی وہ آج بھی معاشرے میں اس کو فروغ دینے کی کوشش کرتے، ایک فکر ان پر ہمیشہ حاوی رہتی کہ جنگ آزادی میں ہم ایک تھے، ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی ایک رہے مگر ہندو مسلمان کو مٹھی بھر منظم لوگ

ایک ہونے نہیں دے رہے تھے، رتھ نکالا گیا کہ رام جی قید ہیں۔

وہ ضعیف العمر بھی اپنے چاروں پوتوں کی شادیاں کر دینا چاہتا تھا اور اپنی چوتھی نسل کا منھ دیکھنا چاہتا تھا، ان کے ساتھ اپنے بچے ہوئے دنوں کو گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے تین پوتوں کی ایک ساتھ بڑی دھوم دھام سے شادیاں کیں، اس دھوم دھام میں بھی ایک دلکش سادگی تھی، بیویاں صوم وصلوٰۃ کی پابند اور شوہر پرست تھیں۔ ضعیف العمر انھیں دیکھ دیکھ کر مسرور ہوتا اور پوتوں کو ہدایت کرتا رہتا کہ خوش رہو، زندگی کو نعمت جان کر اس کا بھرپور لطف اٹھاؤ مگر اپنے پروردگار کو بھولنا مت......

زمین وآسمان کی گردش جاری رہی اور فضا میں کثیف دھواں دھیرے دھیرے چھاتا رہا، اسی درمیان بابری مسجد ہندواگروادیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئی۔ پورے ملک میں فسادات جاگ اٹھے۔ کہیں جشن تھا تو کہیں غم وغصہ۔ ملک جل رہا تھا۔ کھربوں کی املاک تباہ وبرباد، ہزاروں بے گنہ لوگ مارے گئے۔ جن میں لڑکے، بچے، عورتیں، بوڑھے، جوان شامل تھے، ہزاروں عزتیں تارتار ہوئیں، محافظ مدد کے نام پر نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر ہمیں تو اپنے ملک میں ہی جینا مرنا ہے۔ آدرشوں کے نام پر چھاتیاں کاٹی گئیں۔ سرِ راہ برہنہ لاشیں، جلے مکانات، تباہ وبرباد لوگ، نہ بھولنے والی باتیں بھی بھول جانا پڑیں۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ دھیرے دھیرے زخم مندمل ہونے لگے اور حالات سدھرنے لگے لیکن یہ لمحاتی خوابوں کی طرح ثابت ہوئے، آنکھ کھلتے ہی جلن کا احساس، تنگدلی کی باتیں موجود" کاروبار ہمیں اپنوں ہی سے کرنا ہے مسلمانوں سے نہیں"...... یا اللہ...... یہ کون سا ہندوستان ہے؟ جنگ آزادی میں تو ہم بلاتفریق ساتھ ساتھ رہے اور آج اتنی زبردست تفریق۔ کیا میں نیند میں ہوں؟ ایسا بھی نہیں ہے لیکن وہ منظر...... خون آشام منظر جب چہار سو سے بھیانک ڈراونی آوازیں آرہی تھیں، مارو، مارو! ایک بھی بچ کر جانے نہ پائے، کسی کے ہاتھ میں تلوار تھی تو کسی کے ہاتھ میں پٹرول، دیا سلائی، ہزاروں کے ہاتھوں میں جان لیوا ہتھیار موجود تھے۔ کوئی روپیہ لوٹ رہا تھا تو کوئی عزت، مکانوں میں موجود قیمتی سامانوں کو دہشت گرد

لوٹ رہے تھے، مجبور و بے سہارا لوگ مدد مدد پکار رہے تھے مگر مدد کے نام پر قہقہے گونج رہے تھے۔ آگ کے شعلے جسم و جاں کو نگل رہے تھے۔ تفریق مٹ چکی تھی، جلی ہوئی لاشیں بچے، بوڑھے، ماں باپ، بھائی، بہن سب لاشوں میں تبدیل۔ پڑوسی پڑوسی کا دشمن ہو گیا تھا کل تک تو یہی لوگ ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک تھے۔

شاہراہ پر وہ ضعیف العمر لاٹھی کے سہارے کھڑا تھا اس کے قریب حاملہ جوان عورت۔ ضعیف العمر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ جوان عورت اپنے شوہر کے دادا کا چہرا تک رہی تھی کہ اچانک ضعیف العمر بول اٹھا۔ بیٹی چلو کہاں؟ ہمیں اپنا گھر پھر سے بنانا ہوگا۔ بابا، اب وہاں کچھ نہیں بچا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

بیٹی ہم نے اس ملک کو انگریزوں سے آزاد کرایا تھا اپنا سب کچھ قربان کر کے......اب ہمیں ایک اور لڑائی لڑنی ہے نفرت کے خلاف۔ فرقہ پرستوں، دہشت گردوں کے خلاف۔

☆☆

فیصلہ

برساتی نالے کا شور اس کے ذہن میں پیوست ہو چکا تھا۔ وہ جتنا اس شور کی گونج سے دور بھاگتا۔ شور اس پر اتنی ہی تیزی سے مسلط ہوتا جاتا تھا۔

کاش وہ برسات کے دنوں میں اپنے گاؤں نہ جاتا مگر اس کو تو ہر حال میں گاؤں پہونچنا ہی تھا۔ شہر میں وہ جو کام کرتا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ بیکاری اس پر پوری طرح غالب ہوتی جا رہی تھی۔ دن بھر کمرے میں پڑا وہ بور ہوا کرتا تھا۔ اب کام کا آرڈر کب آئے گا؟ وہ اس کے بارے میں بالکل جانکاری نہیں رکھتا تھا۔ ایک ایک دن گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ان حالات میں اسے اپنے باپو کا خط ملا کہ فوراً گاؤں آؤ۔ اور وہ گاؤں کے لیے چل دیا۔

گاؤں تک پہونچنے کے لئے ایک برساتی نالے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ نالا صرف برسات میں ہی پھیل کر ندی کا روپ لے لیا کرتا تھا۔ باقی دنوں میں برائے نام ہی پانی ہوا کرتا تھا۔ وہ تو گاؤں کا ہی آدمی تھا۔ پیدا بھی وہیں ہوا۔ برسات ہو یا گرمی ہو یا جاڑا ہو، وہ پار کر کے ہی آیا جایا کرتا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ تیرنا بھی بہت اچھا جانتا تھا۔ گاؤں کے تالاب اس بات کے گواہ تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے اچھا تیراک تھا۔

اب کی بار جب باپو کی چٹھی پا کر برساتی نالے کے قریب پہنچا تو نالے کا وشال روپ دیکھ کر سہم سا گیا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ نالے کو پار کر کے جائے لیکن گاؤں پہونچنا ضروری تھا۔ نالے کو پار کرے یا نہ کرے وہ وسوسوں کے درمیان الجھا

ہوا تھا کہ بچپن کا دوست وہاں آ گیا۔ اور اسے آواز دیتے ہوئے بولا۔ ارے بالیشور۔ تو کب شہر سے آیا؟

وہ مسکراتے ہوئے بولا، ''بس ابھی چلا آ رہا ہوں نندو۔''

''تو چل گاؤں''، نندو نے بالیشور کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اور نندو کے ساتھ برساتی نالے کو پار کرتا ہوا اپنے گاؤں آ گیا۔ بالیشور تو گھر جا۔ میں اپنے گھر ہو کر آتا ہوں، پھر باتیں ہونگی۔ نندو یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ اور وہ اپنے گھر کی جانب ہو لیا۔ راستے میں گاؤں والوں سے نمسکار کرتا ہوا آخر وہ اپنے گھر کے دروازے پر آ ہی گیا۔ دروازے پر اس کا باپو چھپر کے نیچے کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے باپو کو دیکھ کر باپو باپو کہتا ہوا لپٹ گیا۔ اس کی آواز سن کر اس کی ماں بھی آ گئی اور چھوٹی بہن بھی۔ وہ اپنی بہن کے لئے شہر سے مٹھائیاں لایا تھا۔ دیکھ کملا میں تیرے لیے کیا لایا ہوں؟ بھیا کہہ کر اس کی چھوٹی بہن نے اس کے ہاتھ سے ڈبا لے لیا۔

وہ ہاتھ پیر دھو کر کھانا کھانے کو بیٹھ گیا اس کی ماں نے من پسند پراٹھے جو بنائے تھے۔ کھانا کھانے کے درمیان ہی اس نے اپنی ماں سے پوچھ لیا۔ ''باپو نے اس کو اتنی جلدی کیوں بلوایا؟'' تو اس کی ماں بولی۔ ''ارے تجھے دیکھے ہوئے کافی دن ہوئے اور پھر تیرا ایک جگہ سے رشتہ آیا ہے۔ ہم لوگوں نے لڑکی دیکھ بھی لیا ہے۔ بہت ہی سندر اور اچھی ہے۔ اس لئے تجھ کو بلوایا ہے۔''

بالیشور ماں کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی حیرت کو دیکھ کر اس کی ماں بولی۔ کیوں رے کیا سوچ رہا ہے۔ تو خوش نہیں ہے کیا؟؟'' وہ پھر اپنی ماں کو یاد دلانے لگا۔ ماں، تیرے سامنے ہی تو باپو نے کہا تھا کہ تیری شادی ابھی پانچ سال نہیں ہوگی۔ تو من لگا کر کام کر۔ پیسہ کما پھر تیری مرضی سے شادی ہوگی۔ اور اس کی ماں، اس کے باپو کو آواز دینے لگی۔ ارے بالیشور کے باپو۔ سنتے ہو اپنا بالیشور کیا کہہ رہا ہے۔'' کیا کہہ رہا ہے؟'' اس کے باپو کی آواز سنائی دی۔ یہاں آ۔ تو بتاؤں۔ اس کا باپو باہر

سے اٹھ کر اندر آ گیا۔ تو اس کی ماں نے یاد دلایا کہ بالیشور سے تم نے شادی کے بابت کچھ کہا تھا۔

''ہاں کہا تو تھا'' اس کا باپو بتا رہا تھا۔

پھر کیا ہونا چاہیئے؟ اس کی ماں پوچھ رہی تھی۔

ارے ہونا کیا چاہیے۔ جو ہم نے طے کر دیا وہی ٹھیک ہے اور یہی ہوگا۔''

بالیشور سے تو پوچھ لو۔ وہ راضی ہے یا نہیں، اس کی ماں بولی۔

''پوچھنا کیا ہے۔ شادی کے نام پر تو اس کے من میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔ میں ان لڑکوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس کے باپو نے سمجھایا۔

وہ دونوں کی باتیں کھاٹ پر پڑے پڑے سن رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس کو شادی کے لئے ہاں کرنا چاہئے یا نا۔ اسی الجھاؤ میں وہ سو گیا۔ وہ کافی دیر تک سوتا رہا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو اس کی ماں نے بتایا کہ نندو آیا تھا۔ تجھے اپنے گھر بلایا ہے۔

ضروریات سے فارغ ہو کر وہ ناشتہ کرنے لگا تو باتوں ہی باتوں میں اس نے اپنی ماں سے کہا ابھی شادی نہیں کروں گا تو باپو سے منع کر دے۔ اس کی ماں اس کا چہرا تکتی رہ گئی۔ اور وہ اپنے دوست نندو کے یہاں چل دیا۔ جب اس کی ماں نے بالیشور کا فیصلہ اس کے باپو کو سنایا تو اس کا باپو غصہ سے بھر اٹھا۔ کل کا چھوکرا میری بے عزتی کرا دے گا۔ میری بات خراب ہو جائے گی۔ اس کی یہ ہمت کہ میرے ہوتے ہوئے وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرے گا۔ وہ بیوقوف کیا جانے اس کی بھلائی کس میں ہے۔ ابھی اس نے دنیا دیکھی نہیں ہے۔ اس کا باپو نہ جانے کیا کیا کہہ کر اپنا غصہ اتارتا رہا؟ اور اس کی ماں ایک جانب گم صم بیٹھی ہوئی۔ اپنے پتی کو دیکھتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ بالیشور جب نندو کے گھر پہنچا تو اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نندو کی ماں نے اس کے بیاہ کی بات کی تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ وہی سب کچھ کہہ دیا جو اس نے اپنی ماں سے کہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر نندو کی ماں بولی۔ ''بالیشور تو کیسی باتیں کر رہا ہے کیا

تجھے پتا نہیں، تیرے باپو کی کتنی بدنامی ہوگی۔ ارے پاگل یہ شہر نہیں گاؤں ہے گاؤں، تو وہاں کی نگاہ سے مت دیکھ، بہت فرق ہے۔ بہت فرق ہے۔ جہاں تیری شادی ہو رہی ہے، میں تو وہاں خود نندو کی شادی کرنا چاہتی تھی اور پیغام بھجوایا تھا مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا جب کہ تیرے بیاہ کی بات چیت تو خود ان لوگوں نے چلائی تھی۔ دیکھ تو اپنے باپو کی بات مت خراب کرنا۔ وہ نندو کی ماں کی تمام باتیں سر جھکائے سنتا رہا۔ اور اچھا چاچی اب ہم چلتے ہیں یہ کہہ کر بالیشور چل دیا۔

گاؤں کی ایک ایک گلیاں کوچے، اس کے دیکھے بھالے تھے۔ اور وہ مندر کی جانب اپنے قدم بڑھاتا ہوا نکل آیا۔ یہاں دور تک کھنڈر ہی کھنڈر پھیلے ہوئے تھے، پتھروں کی ٹوٹی ہوئی شلائیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ اپنے پرانے ٹھکانے پر آ گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ جہاں اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اور جب تک گاؤں میں رہا ہر روز وہیں بیٹھا کرتا تھا اور پڑے کنکروں کو اٹھا کر نشانہ لگاتے ہوئے پھینکا کرتا تھا۔ یہ بالیشور کا من پسند مشغلہ تھا۔

لیکن آج وہ بہت خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی کہ زندگی کا فیصلہ کون کرے گا؟ وہ خود یا اس کا باپو۔ اس کی بہتری کس میں ہے، اس کے اپنے فیصلے میں یا باپو کے فیصلے میں۔ وہ خیالات میں الجھا ہوا تھا مگر نتیجہ اس سے کوسوں دور تھا۔ تبھی اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال مانند بجلی کے گونجا کہ دنیا کا تجربہ زیادہ کس کے پاس ہے؟ اس کے پاس یا باپو کے پاس اور جواب اس کے سامنے منہ بائے کھڑا تھا کہ اس کے باپو کے پاس تو بہت تجربہ ہے۔

اور پھر اس نے اپنا فیصلہ اپنی ماں کو سنا دیا۔ جسے سن کر اس کی ماں نے اسے خوشی سے چمٹا لیا۔ مگر کیا؟ تجربہ اچھی زندگی کا ضامن ہے۔ یہ سوال بار بار اس کے ذہن سے ٹکرا رہا تھا!! لیکن اب تو وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

رنگوں کا کاشتکار

میں یہ بات قبول نہیں کروں گا۔

سوچ لو...... مجھے جلدی نہیں ہے۔ باقی تم خود سمجھدار ہو۔

یہ کہہ کر وہ عیار چلا گیا اور میں رنگوں کی دنیا میں کھو گیا۔ اپنے لئے کس رنگ کو منتخب کروں۔ ایک طرف رنگوں کی کائنات تو دوسری جانب رنگوں کی ترتیب کھودتے ہوئے اژدہے۔

پھر میں اس کا دربار چھوڑ کر چلا آیا اپنے گھر۔ سوچ اور فکر کی ایک وادی نے میرا رہا سہا رنگ چرا لیا۔ لیکن میں ٹھہرا رنگوں کا کاشتکار۔ بھلا میں کیوں تنکوں کی طرح اڑتا پھروں؟

وہ میرا ہی نہیں بہت سے لوگوں کا پیارا دوست تھا ہر معاملے میں مدد تو کرتا لیکن اپنے طریقوں سے جو خود اس کی اپنی پہچان ہوتے۔

اپنے ملک میں تین موسم ہوتے ہیں۔ دنیا میں اور کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ رنگوں اور موسموں میں کتنی مماثلت ہوتی ہے۔ یہ حساس اور باخبر افراد جانتے ہیں اور جو رنگوں کا کاشتکار ہو وہ کس انداز و ہنر سے بھرپور ہوگا وہ عیار شاید اس سے باخبر نہیں ہوگا لیکن میں یہ بات مان کر چلتا ہوں کہ وہ باخبر ضرور ہوگا۔ تبھی تو اس درجہ تیزی اور پر وزن رخ سے اپنی بات منوا رہا ہے۔ اور نہ ماننے پر ایک واضح دھمکی کا رخ رکھتا ہے۔ یہ ثابت ہے کہ وہ بھی کم نہیں ہے۔

میں اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا سونے کی کوشش میں مصروف ہوں مگر نیند بند پنجرے

میں پھڑ پھڑا رہی تھی سکون کی چادر تن نہیں پا رہی تھی۔ رنگوں کی ترنگیں اپنے دائرے میں من کو لبھا رہی تھیں۔ اور تھک ہار کر اس نے سونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اٹھ کر لکھنے پڑھنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور فائیلوں کو اِدھر ادھر کرنے لگا۔ فائلیں پرانی تھیں اور ان میں رکھا ہو مواد بھی نیا نہیں تھا کہ اچانک ایک خط پر میری نگاہیں جم گیئں۔ اور مجھے اس عیار کی ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔

خط دیکھتے ہی سارے جسم میں مانو درد کی سرد ہوائیں لہریں مارنے لگیں ہوں۔ رنگوں کی کل کائنات خط میں سمٹ گئی ہو۔ وہی دل کش تحریر۔ لفظوں کی شوخیاں۔ بلند خیال پروازیں۔ کیف و سرور پیدا کرتے ہوے رخ۔ پیار اور محبت کے ترانے خط نہیں ایک زندہ تحریر تھی۔ رنگوں کی مگر اب میرے لیے عذاب تھی۔ فریب تھا۔ خود غرض ہاتھوں سے کھلائی ہوئی۔ اٹھلاتی ہوئی پرچھائیں تھی۔ اور جو رنگوں کی دیوی تھی۔

میں کوئی دوسری دنیا کا دیوتا نہیں تھا۔ جذبوں کی روانی میں رنگوں کی کونین پل بھر کو بجتی اور بگڑ جاتی۔ میں ٹھہرا رنگوں کا کاشتکار۔ رنگون کی ترتیب وار ملاوٹ سے نئے نئے رنگوں کی تحقیق کرتا اور جب ثمر سامنے آتا تو فرطِ مسرت سے چیخ پڑتا۔

رنگوں کی دیوی کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ ایک عام بات کی طرح آئی اور گزر گئی لیکن جب میرے عیار دوست نے اس کی شیریں کیفیت کو عیاں کیا تو مجھ میں اشتیاق و اضطراب پیدا ہو گیا اور میں نے رنگوں کی دنیا میں اس کے لئے حسین رنگ چنا۔ مگر جب اس سے ملاقات ہوئی تو وہ سب سے حسین رنگ تھا۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور ساتھ ہی پیار، محبت و قسمیں بھی پروان چڑھتی گئیں۔ وہ عیار دیوی اور دیوتا کی کہانی عام کرنے لگا تبھی مجھے معلوم ہوا وہ میری دیوی کو پیار کرتا ہے۔ اور اپنے رنگوں سے اس کی تعریف اور دل آزاری بھی کرتا ہے۔ اس کا طرز گفتگو مجھے نہ جانے کیوں بہت خراب لگتا تھا؟ جبکہ وہ عیار جب بھی ملتا رنگوں کا خوب صورت زیور پہنے ہوتا۔

وہ عیار لوگوں کی مدد کرتا لیکن اپنے ڈھنگ سے۔ یہ میں بعد میں جان سکا

میں اس رنگ کی دیوی کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ خود کو تباہ کرتا چلا گیا۔اور اس کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب میں اس عیار کے چنگل میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ میرا سارا کاروبار اس کی گرفت میں تھا۔میری ساری دولت اس کی ہو چکی تھی۔وہ عیار اپنی چال میں کامیاب تھا۔اور میں رنگوں کی دیوی میں الجھا تڑپ رہا تھا۔افسوس کر رہا تھا۔

رنگوں کی دیوی مجھ سے دور اس عیار کی بانہوں میں خود کو محفوظ جان رہی تھی۔ اور رنگوں کی بہاریں لٹا رہی تھی۔وہ عیار اس کے باوجود اب بھی برابر اور نہ جانے کس رنگ کی چاہت میں میرے پاس آتا رہا۔میں لاکھ برابر سوچنے اور چاہنے کے باوجود اس پر رنگوں کی بارش کرتا رہا اور وہ بے حس بت بن کر میرے جذبوں کا مذاق اڑاتا اور مجھے رنگوں کا کاشتکار کہتا۔

☆☆
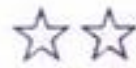
انداز نرالے ہیں بھیا

ساز دل ہو سلامت تو نوشادؔ پھر
کوئی نغمہ سنانا ضروری نہیں

نئے موسم کی آمد آمد کا شور فضا میں گونج رہا تھا درختوں پر نئی کوپلیں، پیلے پیلے پھول چہار سو موجود تھے۔ پل میں سردی کا احساس اور پھر گرمی......کھانسی، بخار، زکام بھی ساتھ ساتھ، بچاؤ کی ترکیبیں اختیار ہو رہی تھیں۔ مگر انگڑائیاں اور چہل قدمی میں کوئی کمی نہیں تھی، خوبصورتی کے متلاشی مناظروں کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کئے ہوئے تھے پھر بھلا ندیم اپنے شوق سے کیوں پیچھے رہتا؟

ندیم کو شکار کرنے کا زبردست شوق تھا اور اس جنون میں وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ رائفل کندھے پر ٹانگی اور گاؤں سے نکل کر دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کی جانب چل پڑا۔ شکار پر جانے سے پہلے ندیم اپنے جگری دوست ابراہیم کو آواز دینا نہیں بھولا۔ ابراہیم میں شکار کو جا رہا ہوں۔ تم سامان لے کر آجاؤ، میں پہلے والے ٹیلے پر انتظار کر رہا ہوں۔

ندیم اور ابرہیم کی جوڑی پورے قرب و جوار میں مشہور تھی، دونوں شکار کے گدھ کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ نیل گائے چڑیا یا مچھلی مارنا ہو، دونوں کو گوشت بہت پسند تھا۔ گوشت.........اپنے ہاتھ سے کئے گئے شکار کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی، گھر والے ناطے، رشتے دار، گاؤں والے جہاں ان دونوں کی دوستی کی

تعریف کرتے وہیں ان کو گوشت خور کہہ کر چڑہاتے، طعنے دیتے، ان کو شکار کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے۔ دوست کہتے شکار ہائے شکار، سالوں کو نیند میں بھی شکار کی ہی سوجھتی ہوگی۔ ان کا بس چلے تو پہاڑوں سے نیچے اتریں ہی نہیں۔ وہیں بسیرا بنالیں۔ ندیم خودسر اور غصہ ور جبکہ ابراہیم ہنس مکھ اور سیدھا تھا۔

ندیم کے والدین کے پاس تین ایکڑ کا باغ تقریباً سو بیگھا کھیتی تھی، کئی مکانات تھے اور پرانا پیسہ۔ گاؤں کے لوگ بڑا گھر کہہ کر عزت دیتے تھے، ان کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ ہر ایک کے دکھ درد میں اور خوشی میں شریک ہوتے تھے جو بھی ان کے پاس آتا، مدد کرتے۔ حال چال پوچھتے۔ بدل رہے حالات پر گہری نگاہیں تھیں ان کے گھر والے ندیم کی شکار پسندی کو کچھ کہتے تو نہیں تھے مگر اچھا بھی نہیں سمجھتے تھے، تین لڑکیاں اور تھیں۔ کل چار بچے تھے، ماں ابھی حیات تھیں، والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں کمی نہیں تھی، ماں نیک اور جہاں دیدہ تھیں۔ سب چل رہا تھا۔ گاؤں کے ماحول میں اب کچھ کچھ شہری بول چال اور پہناوا داخل ہو رہا تھا۔ بجلی تھی نہیں اس لئے ٹیلی ویژن نہیں تھا۔ جلد ہی بجلی گاؤں میں آنے والی تھی۔ بجلی کے پول لگائے جا رہے تھے۔ ابراہیم کے والد دھان کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔ پرچون کی بڑی دکان تھی۔ دس لڑکے لڑکیوں میں ابراہیم ہی سب سے چھوٹا تھا۔ سب کا دلارا اور بہت خوب رو بھی۔ پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بڑے بھائی پرچون کی دکان میں بیٹھتے اور دیگر دھان کی خرید و فروخت میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ گاؤں میں دبدبہ تھا۔ ابراہیم کی والدہ گاؤں بھر میں بہو کے نام سے مشہور تھیں، ہر مسئلہ پر بہو کی رائے ضروری تھی، دو چار عورتیں ہر وقت موجود رہتی تھیں، سب کے لئے پان اور چائے تو رہتا ہی۔

پچھلے ماہ خالہ جان کی بیٹی بلقیس کی بات چیت طے ہوئی تھی، بہو نے ہی سارے معاملات دیکھے تھے لڑکی بہت ہی خوب صورت تھی سوائے کچھ لفظوں کے آگے اس کی تعلیم نہیں تھی جب کہ دوسرے گاؤں کا لڑکا پڑھا لکھا تھا۔ وہ اس رشتے

سے خوش نہیں تھا کیونکہ اس کو بیوی پڑی لکھی چاہیے۔ بہو نے ہی بگڑتی ہوئی بات کو بنایا تھا یہ کہہ کر کہ بلقیس کو میں تعلیم دلواؤں گی مگر شادی ہو گی اب ایک سال بعد لڑکے والوں کو شرط پسند آئی۔

گاؤں میں کوئی بھی اسکول نہیں تھا بس گھریلو تعلیم تھی۔ بہو نے بڑی جدو جہد کی اور گاؤں میں ایک معلمہ کو لائیں۔ گاؤں کے تمام دیگر پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ تعلیم کی ضرورت گاؤں میں بتائی۔ قمر جہاں ایک سمجھدار معلمہ تھیں، حالات کو دیکھا اور سمجھا۔ راضی ہو گئیں اسکول چلانے کو۔ دقتیں تو تھیں ہی مگر ماحول سے ٹکرانے کا جوش اور جذبہ تھا قمر میں........ نامناسب حالات میں قمر جہاں نے خود اپنی تعلیم پوری کی تھی، کچھ کر دکھانے کا ذہن ہی اس کو گاؤں میں لایا تھا۔

اسکول تو کھل گیا مگر تعلیم نسواں کو لے کر طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ ارے اسکول کی تعلیم سے بگاڑ پیدا ہوگا۔ لڑکیاں کیا لڑکوں جیسا کپڑا جینس ٹی شرٹ پہننے لگیں گی۔ کون سا نوکری کروانا ہے۔ اس مشکل بھرے ماحول میں قمر جہاں نے محنت اور محبت سے کام کیا۔ تعلیم کی ضرورت اور ترقی کو بتایا۔ مختلف سوالات کے جواب دیئے۔ تب کہیں جا کر کچھ لڑکیاں پڑھنے کے لیے تیار ہوئیں.......... ندیم اور ابراہیم کو بھی اس اسکول کی خبر لگی۔ سب سے زوردار خبر تھی ان کے نزدیک قمر جہاں، جو دھول بھرے گاؤں کی ٹوٹی گلیوں اور راستوں میں بہہ رہے گندے، غلاظت بھرے، جہاں قدم رکھنا سنبھل سنبھل کر ہو، تعلیم کو فروغ دینے کے لئے اسکول چلا رہی تھیں، جوان، خوبصورت بات چیت کا شائستہ لہجہ، پہناوا، چال ڈھال میں ایک منفرد انداز۔ پہلی بار جو دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ نقاب نہیں سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے، جوان ہی نہیں بوڑھے بھی دیکھنے کو مجبور تھے۔ گاؤں کا اپنا انداز اور ماحول الگ ہوتا ہے۔ جہاں راستے تک درست نہ ہوں، اس کا عالم کیا ہوگا۔ بے گاری، بیکاری وقت کاٹنے کے لئے غلط روش اور نہ جانے کیا کیا بازیاں عام تھیں۔ کل ملا کر پچھڑا ہوا گاؤں تھا۔ ضرورت کی ہر چیز دور کافی دور شہر سے آتی تھیں۔

ندیم نے قمر جہاں کو جب پہلی بار دیکھا تو اس کو جھٹکا سا محسوس ہوا۔ ندیم کو رائفل اور ابراہیم کو گوشت کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ ابلتے ہوئے لہو کو دیکھ کر جو فرحت ندیم کو ہوتی تھی اس سے کہیں زیادہ قمر جہاں کو دیکھ کر ہوئی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے جانے لگے۔ شکار اگر قمر جہاں ہو تو......... ابے ندیم کیا سوچ رہا ہے؟ ابراہیم نے آواز دی......... کچھ نہیں، ابے کچھ نہیں، ندیم نے ہڑبڑاہٹ میں جواب دیا......... کیا ہو گیا ہے تجھے، چل شکار پر چلتے ہیں۔ ابراہیم پھر بولا..... نہیں موڈ نہیں ہے۔ ندیم کا جواب تھا..... ابے، کیا بولا موڈ نہیں ہے؟ مجھے حیرت ہے زبردست حیرت، ضرور تیری طبیعت خراب ہے۔ چل بتا؟ کیا بات ہے؟۔ ابرہیم کہہ رہا تھا.... مگر ندیم کچھ نہیں بولا۔ ابرہیم کو دیکھتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔ ارے سن تو ندیم۔ لیکن ندیم یہ جا وہ جا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ابراہیم کے چہرے پر تناؤ۔ پریشانی صاف ظاہر تھی۔ ندیم اس کے بچپن کا بہترین دوست مگر اس کو کیا ہو گیا؟ آخر کون سی وجہ تھی جو اس طرح ندیم چلا گیا۔ ایک فکر طاری تھی ابراہیم کے ذہن میں....... ابراہیم کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ندیم کو اچانک کیا ہو گیا؟...... ندیم کا اس طرح چلے جانا کیا ثابت کرتا ہے؟ سوالات ہی سوالات تھے مگر جوابات منہ چڑھا رہے تھے۔ شاید فطری خواہشیں جوان ہو اٹھی تھیں ندیم کی...... مگر قمر جہاں ان باتوں سے غافل، اپنا اسکول چلانے میں مست.............

دھیرے دھیرے اسکول میں لڑکیوں کی خاصی تعداد پڑھنے آ گئی تھی۔ قمر جہاں ایک مثالی پیکر جو گاؤں کے لئے زبردست ایثار و قربانی کا جزبہ رکھتا تھا۔ چاہت میں اگر اظہار کا دخل نہ ہو تو وہ یک طرفہ مانی جاتی ہے۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ ندیم کا بھی تھا........ بہو اور قمر جہاں دو نام تھے جو پورے گاؤں میں اپنا الگ مقام رکھتے اور ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بہر حال جو کرے گا وہی مقام پائے گا۔ تعلیم کی بہار نے سارے گاؤں کو اپنے حصار میں داخل کر لیا تھا۔ اب لڑکیوں کے ساتھ ساتھ لڑکوں کو بھی تعلیم دلائے جانے کی بات ہونے لگی۔ قمر جہاں نے کئی معلم سے اس

بابت بات چیت کی مگر وہ بھی گاؤں بیہڑ گاؤں ہے کہہ کر پیچھے ہٹ گئے پھر بھی جستجو جاری رہی آخر کار کامیابی ملی اور طاہر احمد نے اپنی رضامندی دے دی اب دونوں کلاسیز لینے لگے۔ ماحول بنا پڑھنے پڑھانے کا۔ جواں افراد بھی راغب ہونے لگے۔

ندیم نے ایک دن اپنے دل کی بات ابراہیم کو بتا ہی دی کہ قمر جہاں کو چاہتا ہوں، اچھی لگتی ہے۔ تو یہ بات ہے بیٹا۔ ابراہیم نے ہنس کر کہا لیکن اس میں اور تجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ابراہیم کے بچے، شادی تو وہ کرے گی ہی تو مجھ سے کیوں نہیں۔ کیا نہیں ہے میرے پاس؟......... اچھا اچھا، بات کروں گا۔ اب دماغ مت چاٹ، ابراہیم نے جواب دیا اور ندیم ہنسنے لگا.........

ابرہیم نے اپنی ماں یعنی بھو کو ندیم سے ہوئی باتوں کو بتایا۔ بھو نے برا سا منہ بنا کر ابراہیم کو ڈانٹا۔ خبر دار جو قمر جہاں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کیں۔ کہاں قمر جہاں اور کہاں؟ جنگلی ندیم۔ اس نے سوائے شکار کرنے کے آج تک کیا کیا ہے۔ الف بے بھی تو نہیں جانتا اور چلا ہے کمبخت قمر جہاں سے شادی کا خواب دیکھنے........

ابراہیم نے سیدھی سیدھی جو باتیں بھو سے ہوئیں، ندیم کو بتا دیں۔ ندیم کے اندر کا جانور یہ سب سن کر دہاڑنے لگا۔ جس کی گونج سے ابراہیم کو دہشت ہونے لگی اور وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

قمر جہاں کے بارے میں ابراہیم سوچتا تھا کہ ندیم کیا کرے گا؟ کون سی ترکیب اختیار کرے گا؟ بے عزتی کا بدلا کیا ہو سکتا ہے؟ قمر جہاں ان تمام حالات سے بے خبر، اپنے درس و تدریس میں جٹی ہوئی تھی۔ طاہر احمد بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے مگر ندیم کے رگ و ریشہ میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ جس کا اظہار کرنے کو وہ بے چین و بے قرار تھا۔

بھو نے موقع نکال کر ایک دن ندیم کی حرکتوں اور خواہشوں کے بابت اس کی والدہ کو بتایا تو انہوں نے بھو سے کہا کہ اس میں غلط کیا ہے اگر ندیم جیسا لڑکا قمر جہاں کو پسند کرتا ہے تو شادی ہو ہی جانی چاہئے۔ قمر جہاں خوش رہے گی۔ عیش کرے گی، عیش کرے گی مگر جوڑی درست نہیں کہی جائے گی۔ بھو نے ٹکا سا جواب دیا۔ ندیم کی

والدہ بہو کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔

ایک جانب قمر جہاں ایثار و قربانی کے جذبوں سے سرشار ہو کر کام کر رہی تھیں تو دوسری طرف ندیم پر شادی کا بخار چڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہر حال میں قمر سے ندیم شادی کرنا چاہتا تھا...... بہو نے قمر جہاں سے بھی پوچھا.... اچھا۔ ندیم صاحب مجھ سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں، مگر میں ان کو پسند نہیں کرتی ہوں اور ابھی تو کرنا بھی نہیں چاہتی ہوں مجھ سے بڑی ایک بہن موجود ہیں۔ میرا مقصد ہے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا، اپنی بہن کی پہلے شادی کرنا۔ میری ذات سے معاشرے کا بھلا ہو پھر اس کے بعد اپنے بارے میں سوچوں گی۔ یہ کہہ کر قمر جہاں ہنس دیں۔

☆☆

آمین

لٹے پٹے لوگ، ذہنوں میں خوف وہراس، سر سے پیر تک مظلوم، اپنی عزت وآبرو بچانے میں سرگرداں، مدد کے نام پر ہاتھوں میں بندوق اور گولے تھما دیئے گئے، مستقبل کے نام پر موت۔

بوڑھے افراد اپنی نسلوں کی بقاء کو لے کر پریشان، مظاہرے، تحریکیں، اور تحریری وتقریر سوالات وجوابات سے دنیاوی منظرنامے پر خاک وخون میں لپٹے، آگ اگلتے ہوئے دہشت گرد، اور بے گناہ انسان مرتے ہوئے۔ فطری حسن سے مالا مال پھولوں بھری وادیاں، درد میں ڈوبی صبح وشام، فہیم شیخ کو ان دنوں کچھ زیادہ ہی اس پار بسے اپنے رشتے داروں کی یاد ستا رہی تھی، ہر لمحہ امی ابو کا تصور، چاچا چاچی، بھائی بہنوں کا پیار، ان کو رونے پر مجبور کیے ہوئے تھا۔ سیاست نے ان کے بال و پر کاٹ رکھے تھے۔ صرف صدائیں، آہیں، خون کے آنسو فہیم شیخ کا زیور ہو چکے تھے۔ ایک فہیم شیخ ہی نہیں لاکھوں کی تعداد چہروں پر چہرا جمائے ہوئے تک رہے تھے۔ ہر پل نئی نئی کہانیاں اور نئے نئے باب کو کھلتا اور بند ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ہمدردی کے نام پر کوئی مرچ فراہم کر رہا تھا تو کوئی نمک سلیمانی۔ بربادی کا ہر ساز وسامان بازار میں موجود تھا۔ مستقبل کے تاجر پیسہ لگا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

جہاں ہلاکت خیز بارشیں تھیں وہیں کچھ مضطرب دل ودماغ بھی تھے، جو اس منظرنامے پر لہو بہا رہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ پھولوں بھری وادیوں میں سکون واطمینان کے بادل برسیں، بندوقیں نہیں مدد کو ہاتھ سامنے آئیں، دھول اڑاتی فضا میں خوشحالی

کے نغمے گونجیں، ایسا ماحول رونما ہو جو امن قائم کرنے میں تعاون کرے، پڑھنے اور کام کرنے کا موقع عطا کرے۔

اس پار بھی لوگ اپنے ناطے رشتے داروں سے ملنے کو بیتاب مگر فوجی حکومت کے آگے بے بس، سرحدیں بنا دی گئیں اور ہر حالت میں حکمرانی قائم رکھنے کی ضدوں نے سب کچھ چوپٹ کر رکھا تھا۔ بے بس افراد، احتجاج کرتے ہوئے افراد، مارتے مرتے ہوئے افراد، اپنے اپنے موقف کو مختلف نام دے رہے تھے، زبردست عوامی اور ذہنی دباؤ کے پیش نظر، بات چیت کا دور شروع ہو جاتا ہے، دونوں جانب ایک آس بندھ جاتی ہے انسانی رشتے کامیاب ہوتے ہیں یا سیاست یا پھر دونوں، دنیا دیکھ رہی تھی کہ گرد آلود راستے کھولنے کی بات ہونے لگی، انسان تو سنگ دل ٹھہرا مگر جس نے حسین و جمیل دنیا بنائی ہے اس نے اس طرح کے رنگ بھر دیئے کہ آن واحد میں انسان اور انسانیت کی بقاء کی آوازیں دل و دماغ کو جھنجھوڑنے لگیں ایک قہر رونما ہوا اور پھر ہائے توبہ مچ اٹھی۔ انا کی دیواریں گر گئیں۔ اب کیا ہوگا؟۔ انسانوں کا کیا ہوگا؟ مرتے ہوئے لوگ، بھاگتے ہوئے لوگ۔ ویرانی وحشت اور کس طرح بچا جائے۔ قربانیاں دیتے اور لوٹ پاٹ کرتے لوگ۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو انسانی نسل کو ہر حال میں بچانے پر آمادہ تھا۔ شاید آیا ہوا قہر محبت کا پیغام دے رہا تھا کہ اے دنیا کے مغرور اور ترقی یافتہ انسانوں، غرور کا طوق پھینک دو، جو کمزور ہیں ان کی مدد کرو۔ نہیں تو ہلاکتیں تمہاری تقدیروں میں پیوست ہو جائیں گی۔

یہی امن وانسانیت بھرا پیغام تھا جس نے سرحدوں کو کھول کر مدد کی، دل کھول کر اور دوستی بھرا ہاتھ پیش کیا۔ دنیا نے داد و تحسین، آفریں، آفریں کی صداؤں سے نوازا۔ سرد برفیلی ہواؤں کے درمیان کھانا، پانی اور رہنے کے انتظامات ہونے لگے۔ اعلیٰ اور بااختیار لوگ ان کے درمیان گئے، مرہم اور دوا نے خلوص کے پودوں کو اور ہرا بھرا کر دیا۔ رشتوں میں اور مضبوطی آئے، دونوں جانب امن و اماں، خوشحالی رقص کرے، دکھ درد میں شمولیت، خواب حقیقت میں بدل جائیں۔ دعائیں

گونج رہی تھیں۔

افراد آ اور جا رہے تھے۔ امرتسر سے لاہور بس سروس میں خیر سگالی گروپ، علم و ادب، انسانی فلاح، بہبودا اور نفرت کی فضا کی جگہ اپنائیت اور پیار کی باتوں کو فروغ دینے پر آمادہ، مماثلت کی تلاش، ایک دوسرے کی خیریت اور مدد کا وعدہ، ملکی مفادات کے معاہدے، ایک نیا باب نئی تصویر۔ ان تمام دردمندوں کو سلام، جن کی کاوش سے بچھڑے ہوئے دلوں کو سکون ملا اور وہ اپنے لوگوں سے مل سکے، اب کبھی ہم الگ نہ ہوں، ایسا کچھ ہو جائے۔ اس طرح کے جذبات اور احساسات ہواؤں میں گونج رہے تھے، تخریب نہیں تعمیر کے داعی آمین کہہ رہے تھے۔

زندگی دوسروں کے لیے

ہوائیں نقش چھوڑ جاتی ہیں تحریریں موتیوں کی طرح چمکتی رہتی ہیں۔ رات دیر تک وہ پلکوں میں سوالات اور خوابوں کے درمیان جاگتی سوتی رہی...... کب نیند کی آغوش میں سما گئی! یہ تو اماں جی بھی نہیں بتا سکتیں کیوں کہ مشتر کی بے چین راتوں کی وہ چشم دید گواہ تھیں۔ مشتر کی ہر وقت بے قرار رہتی آنکھوں کو دیکھ کر اماں بی میں خوف سرائت کر چکا تھا، نجانے کون سی گھڑی تھی جب مشتر میں خود اعتمادی کا جذبہ بیدار ہوا، اور اس قدر جاگا کہ وہ بے چین و بے قرار ہو اٹھی۔

بایاں پیر خراب تھا پیدائشی، اماں جی نے پرورش کی خواہش ظاہر کی تو صداقت میاں نے مشتر کو ان کی گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ دن تھا اور آج تک اماں بی نے ہر پل مشتر کو اپنے سے کبھی الگ نہیں کیا۔ رو دھو کر ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی۔ صداقت میاں کے یہاں اماں بی کا آنا جانا تھا پڑوسی ہونے کے ناطے، صداقت میاں نے اماں بی کو بتایا تھا کہ ان کی بیگم مشتر کی پیدائش پر نہیں رہیں، میاں کے اور کوئی اولاد نہیں تھی، ہزار منتوں، مرادوں کے بعد مشتر پیدا ہوئی لیکن صداقت میاں کے حصے ادھوری خوشی رہی۔ مشتر کو دیکھ کر وہ بھی جاتی رہی... پہاڑ کی طرح یہ سوال کھڑا رہتا کہ مشتر کو کیسے پالا جائے؟ ایک دو تین دن ہو رہے تھے۔ اسپتال والے بنا پیسوں کے کوئی بھی مدد نہیں کرتے، ان کے بھی تو اپنے خرچ ہوتے ہیں۔ صداقت میاں دل و دماغ میں اٹھ رہے مختلف سوالات سے لڑ رہے تھے۔ مشتر کا کیا ہوگا؟ مشتر کا بایاں پیر خراب دیکھ

دیکھ کر صداقت میاں اپنا ماتھا ہر بار رگڑ رہے تھے۔ بیوی کی موت کا غم، اوپر سے پیدا ہوئی بیٹی کا بایاں پیر خراب.... کیسے؟ کیسے پرورش ہوگی مشتر کی۔ ہر لمحہ صداقت میاں رو رہے تھے مگر سوالات پھر بھی موجود تھے، منہ چڑا رہے تھے۔

اماں بی کو صداقت میاں کی پریشانیاں اور مجبوریاں معلوم ہو چکی تھیں، بھلا باتیں بھی کہیں اور کب تک چھپتی ہیں۔ اماں بی بڑے دل گردے کی مالک تھیں، بھری جوانی میں شوہر کی موت ہو اٹھی اور خاندانی رنجش میں دو بیٹوں کو تالاب میں ڈبو کر مار دیا گیا تھا۔ ان کی عمریں رہی ہوں گی بمشکل سات اور نو سال، کلیجہ پھٹ اٹھے ان منظروں کو دیکھ کر، یہ سب دیکھ کر اماں بی کے ساس سسر بھی نہیں رہے، درد اپنی حدیں توڑ چکا تھا۔ ہر طرح سے بہہ جانے کو بے قرار لہریں..... غضب ناک لہریں اٹھ رہی تھیں مگر اماں بی میں بلا کی صلاحیتیں جاگ چکی تھیں، ان دل سوز حادثات نے اماں بی کو ذہنی طور پر بہت پختہ کر دیا تھا۔

صداقت میاں کو اماں بی کی خواہش نہ چاہتے ہوئے بھی پسند آئی، مشتر کو اماں بی کی گود میں ڈال کر صداقت میاں ایسا سوئے کہ پھر کبھی اٹھ نہ سکے۔ بستر کی سلوٹیں صداقت میاں کے ذہن میں اٹھ رہے طوفان کو عیاں کر رہی تھیں دیوار و در خاموش تھے۔ ہوائیں بھیانک شور مچا رہی تھیں مگر صداقت میاں خاموش تھے۔ اپنی یادیں، درد، خوشیاں، سب میاں کے ساتھ چلا گیا۔ مشتر کو چھوڑ، صداقت میاں کے خاندان میں اور کوئی نہیں تھا۔ لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ صداقت میاں کا گھرانا بہت نیک تھا، دبدبے والا تھا، مگر بھائیوں میں اتفاق کی جگہ نفرت اگ جانے کی وجہ سے سب آپس میں گولیوں کا شکار ہوا تھے۔ ایک صداقت میاں ہی بچے تھے۔ صداقت میاں کے والد نے تین شادیاں کی تھیں، زمین جائداد وراثت میں خوب ملی، اکھڑ اور ضدی پن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ان کے والد میں، والد کی سختی اور بھائیوں کے برتاؤ سے گھبرا کر صداقت گاؤں سے شہر آ گئے تھے۔ پہلی بیوی سے ایک صداقت میاں ہی تو تھے۔ دولت کی فراوانی نے صداقت میاں کے والد کو دو اور شادیاں رچانے پر مجبور کر دیا تھا۔ صداقت میاں کی والدہ بے عزتی، روکھے

پن کی وجہ سے زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں۔

اماں بی اپنی دردمندی اور خلوص کی وجہ سے پورے علاقے میں مشہور تھیں، اس دور میں اماں بی کا پیکر نایاب تھا۔ان کا اخلاق ان کی سوچ کے مختلف مطالب کم ذہن لوگ نکالتے رہتے تھے مگر وہ چاندنی کی طرح پاک وصاف تھیں، صداقت میاں کی موت پر اماں بی بہت روئیں، احساسات اور وقت کے فیصلوں نے شاید اماں بی کو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔

مشتر کے وجود کو اماں بی نے اپنا وجود تسلیم کیا اور پھولوں کی سیج پر اس کو کھلایا پلایا اور چلایا۔ مشتر جب کھڑی ہوتی تو اس کو سہارے کی ضرورت ہوتی تھی، اماں بی ہر مقام پر اس کا سہارا بنیں۔

مشتر اب بولنے لگی تھی، اماں بی کو اس کی آواز رس گھولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ معصوم مشتر اماں بی کہہ کر جب بولتی تو ایک عجیب وغریب کیفیت کا احساس محسوس کرتیں۔

ہنستے کھلکھلاتے اور روتے ہوئے مشتر کا بچپن بیت رہا تھا...... مشتر جب بستہ لے کر اسکول جاتی تو اماں بی کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ ساری دنیا کی خوشیاں ان کو مل رہی ہوں اور ان کے اثرات سے ان کا چہرا چمک دمک رہا ہو، دور تک پھولوں کی مہک کا جادو ہو۔

مشتر اس طرح کے جوتوں کا استعمال کرتی کہ دونوں پیروں کی لمبائی ایک سی ہو جاتی تھی، اماں بی نے بڑی جدوجہد کے بعد ان جوتوں کو بنوایا تھا۔ان جوتوں کو پہن کر جب مشتر نکلتی تو اس وقت اس کے چہرے کی رنگت میں اور نکھار جاگ اٹھتا تھا اور اعتماد جھلکتا تھا۔

بول چال کا انداز بہت پیارا تھا، معلوم ہوتا کہ پھول جھڑ رہے ہوں اور ان کی مہک فضا میں تیر رہی ہو۔

مشتر میں بلا کی ذہانت تھی۔اماں بی کی تربیت نے مشتر میں خوبیاں ہی خوبیاں بھر دی تھیں، جب اماں بی سے علاقے کے لوگ مشتر کی خوبیاں بیان کرتے تو ان کا سر

فخر سے اونچا ہوا اٹھتا اور وہ محسوس کرتیں کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں ہوئی۔

مشتر جہاں پڑھتی تھی اس اسکول میں مدر ڈے پر ایک ادب استقبالیہ پروگرام کا انعقاد ہو رہا تھا۔ اماں بی پروگرام میں جانے کے لیے اپنے کپڑوں کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مشتر بھی الماری کے پاس کھڑی تھی کہ کپڑوں کے درمیان سے ایک لفافہ نیچے فرش پر آ گرا۔ اماں بی کے منہ سے نکلا۔ ارے......

مشتر نے جھک کر لفافہ اٹھالیا۔ اس میں چند تصویریں اور ایک خط تھا۔ مشتر کے چہرے پر سوالات تھے۔

اماں بی مشتر کو بتا رہی تھیں کہ یہ میرے شوہر ہیں جن کا قتل ہو چکا ہے، یہ میرے دو معصوم بیٹے ہیں جنھیں ظالموں نے ڈبو کر مار ڈالا...... اماں بی کے آنسو رواں تھے اور یہ تصاویر تمھارے والدین کی ہیں۔

یہ میرے والدین کی تصویر ہے۔ مشتر حیرت سے تصویر کو تک رہی تھی۔ یہ میرے والدین ہیں۔ بڑی مشکل سے بول پائی۔

اماں بی پھر بولیں۔

ہاں بیٹی یہ تمہارے والدین ہیں۔ اماں بی پھر بولیں۔

نہیں نہیں۔ اماں بی، آپ ہی ہماری سب کچھ ہیں۔ یہ کہہ کر مشتر اماں بی سے چمٹ گئی۔

آبشار کا درد

پرچھائیں جس طرح انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی اسی طرح خوبصورت یادیں، زندگی کی کشتی دریا کے پانی میں رواں دواں رہتی ہے۔

میں تھا میری یادوں کا آبشار جس سے میری روح سیراب ہوتی رہتی میرے تخیل میں خوبصورت پرندے اترتے رہتے اور میری زندگی کو دھنک رنگ بخشتے رہتے۔ دنیا نے میری زندگی کو مختلف نام دئے۔ مختلف عنوان میری کہانی کے رکھے لیکن میں اپنی روش پر گامزن رہا۔

میرا سرمایۂ حیات مجھ سے وابستہ کچھ یادیں میرے پاس تھیں۔ میں جب چاہتا آنکھیں بند کر کے ماضی کی شاہراہ پر دوڑنے لگتا اور حسین وخوشنما پیار کی وادی میں پہنچ جاتا اور مسرور و شادماں ہوتا رہتا کتنے دل چسپ پہلو ہیں۔ میری یادوں کے جو کیف وسرور کے ساتھ، پرچھائیوں کے مانند گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں رنگ و بو کے آبشار لٹے ہوئے۔

میں بے خبر اپنی یاد سے چلا جارہا تھا لگا تار بہتے ہوئے پانی کی طرح خوبصورت وادیوں کے دامن میں سیاہ وسفید پہاڑوں کے درمیان سنگلاخ اور نکیلی چٹانوں سے گزرتا ہوا کیوں کہ میرا پیار، میری روح کا زخم میری کائنات کا ایک ایک ذرہ میری آمد کا جیسے منتظر ہو، میں اپنے آپ میں کھویا ہوا، ڈوبا ہوا، زندگی کی تمام تر لذتوں اور کرب واضطراب کو اپنی روح میں سمیٹے ہوئے۔

جب رات آئی تو میں اپنے کمرے میں لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا کسی کروٹ چین ہی نہ پڑی تو میں الماری سے ایک تصویر نکال کر لیٹے ہی لیٹے حسرت ویاس بھری نگاہوں سے اس کے خدوخال کو دیکھتا رہا۔ کتنا معصوم، کتنا سنجیدہ پروقار چہرا تھا۔ قدرتی خم، ریشمی زلفیں، مسکراتی ہوئی چمک دار آنکھیں، شیریں لب انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے جیسے سارناتھ کے مندر میں مخملی گلاب دہک رہے ہوں۔

وہ ایک مجسم بہار تھی جس کی پرچھائیں میں چاندتارے رقص کرتے تھے۔ میں اس کے خمار آلود پیکر میں کھوتا چلا گیا۔ خود کو ڈبوتا چلا گیا۔ لمحے جاوداں ہوتے گئے شام کیف آگیں، صبح دلاویز، رات نکہت ونور سے معمور، مہکتی ہوئی ہواؤں کے سرور انگیز جھونکے میرے اندر سرایت کرتے رہے اور میری چاہت کو جلا ملتی رہتی۔ میں بہتا چلا گیا ستاروں کی لے پر کہ اچانک میری نوکرانی نے مجھے چائے کے لیے جگا دیا میں ابھی جاگنا نہیں چاہتا تھا لیکن کمبخت نے مجھے بیدار کردیا میرے بگڑنے پر وہ مسکراتی ہوئی معنی خیز نگاہیں لئے ہوئے بھاگ گئی۔ پھر میں پائیں باغ میں چہل قدمی کے لئے چلا گیا۔ دل فریب سفید چاندنی میں ایک پرچھائیں نظر آئی، کھلکھلاتے ہوئے ہواؤں کی طرح نرم وسبک زندگی بخشتے آبشاروں کی طرح رواں دواں، بتوں کی طرح دل فریب خاموشی لئے ہوئے اپنے اشارے کنائے سے اپنے محبوب کو بلا رہی تھی، رجھا رہی تھی۔ میں پرچھائیں لئے ہوئے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا تو وہ اچانک مڑی اور سحر زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی کرنیں میرے جسم کے انگ انگ میں سما گئیں۔ میں مبہوت بنا دیکھتا رہ گیا۔

پھر میرا وجود لمحہ بہ لمحہ تحلیل ہوتا ہوا ایک پرچھائیں کے روپ میں ڈھل گیا اور پھر میرے قدم انجانی راہوں کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ جو حد نگاہ تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پیار کے نغمے گاتے ہوئے بے خبر چلے جا رہے تھے۔ آبشار کے دامن میں میں نے اس سے کہا،

''آؤ آج دیکھیں آبشار کے دہانے کو''۔

''نہیں ،نہیں میں تمہارے علاوہ اور کچھ دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے مت لے چلو''۔

''میری خاطر بھی نہیں''، میں نے بھر پور محبت کا وار کیا۔

اور پھر چل دیئے آبشار کے دہانے کی طرف۔

''ارے یہ پتھر تو پانی کو روکے ہوئے ہے پانی تو ٹکرا ٹکرا کر کناروں سے ابل رہا ہے، تم کیا سوچنے لگے۔''

''ہوں!''میں نے ایک گہری آہ کی جو درد سے بھر پور تھی اور ساری فضا سوگوار ہوئی یہ پتھر آبشار کا درد ہے۔ جو نہ خود سیراب ہوتا ہے اور نہ اپنی ذات سے دوسروں کو فیضیاب کرتا ہے۔

پرچھائیں اور آبشار دونوں کا ایک ہی کام ہے۔ روح کو سیراب کر کے خود زخمی ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆

تصویر

دھیرے دھیرے اسکے قدم اٹھ رہے تھے جانے وہ کن سوچوں کے درمیان گم تھا۔ اپنے گھر کے دروازے پر اس کے قدم خود بہ خود رک گئے اور وہ اندر داخل ہونے کے لئے آواز لگانے لگا۔

''نور بیٹے کیا آج اسکول نہیں جاؤ گے؟''

وہ اپنے لخت جگر سے پوچھ رہا تھا۔

''جاؤں گا ابو جی''، نور نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے؟''

''دادی اماں نے بلایا تھا۔''

نور نے سعادت مندی سے کہا۔

''اچھا اب جلدی تیار ہو کر جاؤ میں بھی کام پر جا رہا ہوں''

اور وہ اپنے گھر سے نکل کر دفتر جانے کے لیے چل دیا۔ نور جب اسکول جانے لگا تو اس کی دادی ماں نے سنبھل کر راستے میں چلنے کی ہدایت دی، بمشکل تمام ابھی نور کی عمر آٹھ دس سال کی رہی ہوگی۔ نور بہت ہی حساس طبیعت رکھتا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر نروس ہو جایا کرتا اور اپنے کمرے میں لیٹ کر خود کو تنہائیوں سے جوڑ لیتا تھا۔ تنہائی تو تھی ہی اس کی رفیق۔ اتنی عمر میں نور کھانا پکانے کے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ گھر کا سارا کام برتن مانجنا، جھاڑو دینا، کپڑا دھونا نور بخوبی کیا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ دادی ماں نے اس کو سکھایا تھا۔ اب تو دادی ماں اس کے کسی کام میں ہاتھ نہیں بٹاتی

تھیں۔ان کی عمر بھی اتنی ہو چکی تھی کہ اٹھ بیٹھ بھی آسانی سے نہیں پاتی تھیں۔آنکھوں سے بھی بہت کم دکھائی دیتا تھا۔نور اپنی دادی ماں کی بھی مدد کرتا تھا۔ان کو کھلانا پلانا،اٹھانا بیٹھانا ضروریاتِ زندگی سے فارغ ہونے کیلئے سہارا دے کر جائے مقام چونکہ گھر میں ہی تھا تک پہنچانا۔نور یہ سب کام بہت ہی ذمہ داری سے انجام دینے کی کوشش کرتا یہ سب کچھ کرنے کے بعد پڑھنے کے لیے اسکول جانا پھر ہوم ورک کرنا۔

وہ نور کو کبھی کبھی کھیلنے کی جانب راغب کرتا۔طرح طرح کے خواب وابستہ کرنے کی کوشش کرتا اور چھٹی کے دن تو خاص کر وہ گھر میں نور کے ساتھ کیرم کھیلا کرتا۔ اس کا دل بہلانے کے لیے اسکول کی باتیں کیا کرتا۔ورک دیکھا کرتا اور نور کو بہت پیار سے مذہب،سیاست،انسانیت اور معاشرے کی باتیں بتایا کرتا۔کن باتوں سے معاشرہ بنتا ہے اور کن باتوں سے بگڑتا ہے؟اخباروں اور رسالوں سے کیا ہوتا ہے؟سمجھایا کرتا۔ نور بہت ہی ذہین تھا۔اس پر اس کو فخر بھی ہوتا تھا۔شام کو ضروری کاموں سے فارغ ہو کر وہ نور کے ساتھ گھومنے بھی نکل جاتا تھا لیکن یہ موقع کم ہی آتا تھا۔وہ اپنی بوڑھی ماں کا بہت ہی خیال کرتا تھا اس کی ذراسی بھی بے چینی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

اس کی ماں بستر پر پڑی اپنے لڑکے اور پوتے کے لیے دعائیں رب کائنات سے مانگا کرتی اور اپنے نصیب پر آنسو بہایا کرتی تھی کبھی کبھی اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی اس کی عیادت کو آجایا کرتیں تو وہ اپنے بیٹے کے لیے،خوشی اس کو کس طرح ملے اس طرح ملے اس کی باتیں کیا کرتی تھیں۔اپنا دکھ بیان کرتیں،ارے بہن اب تو مجھے بالکل دکھائی نہیں دیتا۔میں کس کے پاس جاؤں۔تم تو میری حالت دیکھ رہی ہو اب تمہارا ہی سہارا ہے۔کچھ مدد کردو۔میرا پوتا اس چھوٹی سی عمر میں گھر باری کا کتنا بوجھ اٹھا رہا ہے۔ابھی تو اس کے پڑھائی لکھائی کے دن ہیں۔میں تو یہ سوچ کر اپنا سارا دکھ بھول جاتی ہوں،ننھی سی جان اور اتنا بڑا بوجھ میرے مالک کچھ تو رحم کر۔بہن!تم بھی میری مدد کرو عورتیں مدد کرنے کا وعدہ کر کے مہینوں نظر نہیں آتیں تھیں۔

وہ بھی زندگی کی رفتار میں خود کو بھولتا جا رہا تھا لیکن واقعی تھا کہ ایسا کچھ نہیں۔

ایک طوفان اس کے دل ودماغ میں ہر وقت موجود رہتا جب بھی اس کا زور غالب رہتا تو سارے بندھ ٹوٹ جاتے اور ہر لہر اس کو ایک دوزخ کا نظارہ کرب عطا کرتی۔ نجانے کہاں کی قوت اس میں آ کر سما جاتی کہ وہ اپنے وجود کو ختم نہیں کر پاتا۔ کتنا اضطراب تھا اس کی اپنی حیات میں۔ وہ سوچتا کہ سارے دکھ اس کے نام لکھ دیئے گئے ہیں؟ تبھی تو ہر لمحہ ایک نشتر دے جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ صبح کا سورج اسکے لئے بھی ہونا چاہئے۔ وہ بھی اس کی دلفریب کرنوں سے محظوظ ہو سکے جو زندگی کی خوشحالی کی آمین کہی جاتی ہے چند ساعتوں کے لیے مل جائے اپنے پورے جلوے کے ساتھ وہ بھی تو جانیکے زندگی کا حسین وجمیل رخ وانداز کیا ہوتا ہے؟ اس نے بھی تو اپنی پوری عمر گنوادی اس کا بھی اپنا بیٹا نور ہی جیسا تھا لیکن اتنی گھر داری اس کے وجود نے بھی نہیں اٹھائی تھی۔ گو کہ والد کا سایا بچپن میں ہی اٹھ گیا تھا۔ محنت تو اس نے بھی کی تھی اس کے بڑے بھائی نے اس کو پڑھانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا؟ وہ جب بھی یاد کر لیتا ہے ماضی کی باتیں تو ہر طرف ویرانی رقص کرنے لگتی ہے۔ قہقہوں کی گونج میں سسکتی معصوم آہیں اسے کچھ بھی کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہیں۔ اور .... اور وہ اپنا آپا کھو بیٹھتا ہے۔ بڑے بھائی کے پر بہار ایام بھی یاد کر کے وہ مسرور ہوتا ہے۔ اس کی بھابھی اسے بالکل اپنے بھائی جیسا چاہتی تھی اس کی بات پہلے پھر اس کے بعد ہی سب تھے۔ بڑے بھائی کی موت اور نور کے پیدا ہوتے ہی بھابھی کا مر جانا۔ بھلا وہ کیوں کر، کس طرح بھلا پاتا؟ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ ان حادثات میں وہ کانٹوں کی سیج پر آج تک لوٹ رہا ہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں، سب کچھ نور کے لئے۔ ایک آس۔ ایک امید کی کرن کے لیے وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر رہا تھا اس کا تو نور ہی سب کچھ تھا۔ سب کچھ تھا

نور بھی اب جان گیا کہ اس کے حالات کس درجہ بے بس و نازک ہیں۔ فطرتی باتیں جو حالات اور ماحول کی محتاج نہیں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی اپنا رنگ وروپ عیاں کر دیتی ہیں تو نور کے لیے مانو ایک پہاڑ آ گیا ہو۔ جیسے کہ نور اکیلا ہی اسکول جاتا اور اس کے تمام دوست اپنے والدین کے ساتھ آتے، کبھی ناراض ہو کر ہٹ کرتے

ہوئے ،روتے ہوئے ، مسکراتے ہوئے ۔لیکن نور بھلا کس کے ساتھ اس انداز میں باتیں کرے ،روٹھ جائے ۔اس کے سامنے تو اس کی اپنی ذمہ داریاں ،اس کی بوڑھی دادی ماں اور اس کے ابو کی مجبوری تھی۔ ننھی سی جان ،جب اسکول کی باتیں دادی ماں سے کرتا تو دادی ماں فرط جذبات سے اس کو اپنی چھاتی سے لپٹا کر پیار کرنے لگتیں۔ اور لاچاری و بے بسی پر اس کا دل خون کے آنسو روتا مگر......وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ سوائے رونے کے اور تسلی دینے کے......اپنے ابو کو بھی نور کبھی کبھی اپنی روداد سنا دیا کرتا تھا تو وہ بھی نور کو اپنی پیاری پیاری باتوں سے اس درجہ اثر پیدا کر دیتے کہ نور اس کے سحر میں کھو کر عزم کے ولولے لے کر فطری خیالات کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔لیکن پھر بھی..........

وہ دفتر تو روز جایا کرتا تھا لیکن وہاں کی فضا سے خود کو الگ رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔اس کا ایک ہی دوست تھا۔جس سے وہ اپنے من کی باتیں زبان پر کبھی کبھی لاتا۔اس کا دوست عامر اپنی ایک الگ ہی دنیا میں جیتا تھا وہ دونوں جب کبھی ملتے تو ایک دوسرے سے اپنا دکھ درد بیان کر دیتے۔جس سے شاید ان کا احساس درد کچھ کم ہو جاتا تھا۔

ایک دن دفتر میں عامر کہہ رہا تھا کہ آج کل تم کچھ زیادہ ہی افسردہ رہتے ہو، کیا بات ہے؟اور وہ کہہ رہا تھا......میں تو آج لیکن تم کئی دن سے بارہ بجا رہے ہو۔ عامر کہہ رہا تھا کہ آخر کب تک اس ماحول میں جیوں گا۔کبھی کبھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کیا سارے غم میرے ہی حصہ میں آچکے ہیں؟ نہ کھانے کا وقت اور نہ سونے کا۔ ہر وقت بس پیسوں کا ہی مطالبہ، کہاں سے لاؤں اتنا پیسہ؟ بڑا ہونا بھی کتنی بری شئے ہے اس کا تمہیں بالکل احساس نہیں ہے۔اگر تم بڑے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہوتی ہے اور وہ خلا میں اپنے بڑے بھائی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

صبح کے لٹیرے

کشمیر کی من بھاون وادیوں میں وہ لڑ رہا تھا اپنے ملک کی سلامتی کیلئے، دشمنوں نے اپنا پورا زور لگا رکھا تھا کہ کسی بھی طرح قبضہ برقرار رہے، اس لئے نت نئے واروں سے بے چینیوں میں اضافہ ہو رہا تھا مگر ثابت قدمی اور حکمت عملی نے ان کے سارے حربوں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ یہ جہاں فخر کی بات تھی وہیں دلیری و جاں بازی کے جوہر کو بھی عیاں کر رہی تھی۔

وہ، سیکٹر۔اے، کے مورچے پر تعینات تھا اور بڑی گرم جوشی سے اگلے حملوں کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابھی کل رات کے پچھلے پہر ہی اس کی ٹکڑی نے چند دہشت گردوں سے دونو جوان لڑکے اور ایک جوان خوبرو لڑکی کو چھڑا کر بحفاظت گھر والوں کے پاس ان سبھی کو پہنچایا تھا۔ دعائیں آخر قدموں تک اس نے محسوس کی تھیں۔ وہ خوش بھی بہت ہوا تھا جبکہ اس کے اور ساتھیوں نے کشمیری مزاج وس لینے کی بات کہی تھی، ڈانٹنا پڑا تھا اس کو اور کہنا بھی۔ ''ہمیں مدد کے ساتھ اعتماد بھی بحال کرنا ہے ان کا تبھی یہ ہمارے قریب آئیں گے''۔

وہ جہاں دشمنوں' دہشت گردوں سے لڑ رہا تھا وہیں اس بات پر بھی غور و فکر کرتا رہتا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں اے کے سینتالیس اور بارود کیوں کر ہے؟ وہ بہت صاف ستھری ذہنیت کا مالک تھا۔ اس نے جو کچھ کشمیر کی بستیوں اور محلوں و شاہراہوں میں دیکھا، دل دہل جانے والے مناظر تھے۔ بیکاری، زبردست بیکاری، تعلیم کی کمی نے ان کے فکری سوتے بند کر دیے تھے، دست کاری پر غنڈوں موالیوں نے قبضہ کر

رکھا تھا جو دام کے نام پر صرف اتنی ہی روٹی دیتے جس سے جسموں کی سانسیں چلتی رہیں، باغات پر گدھ کی نگاہ رکھے ہوئے باہری لوگ جبکہ تمام باغات کے مالک اور مزدور کشمیری ہی تھے، رشتوں اور اقرباء پروری نے اور گل کھلا رکھے تھے، نئے نئے فرمان اور فتووں نے ان کی زندگیوں میں اور بندشیں بڑھا رکھی تھیں، نغمات گھائل ہو کر شعلہ بن اٹھے تھے، خوبصورت گھاٹیاں، ان کے دل کش قدرتی مناظر جو انسانوں سے ان کے حواس چھین لینے کے لیے مشہور تھیں، آج لہو میں ڈوبی ہوئی بربادیوں، ویرانیوں کی داستانیں بیان کرتی ہوئی موجود ہیں۔ بجھے بجھے نقوش، بے رنگ قد وقامت، پریشاں حال چہرے، اضطراب میں ڈوبے ہوئے خوش فکر نعرے لگاتے ہوئے موجود خواتین بھی مردوں کے ساتھ شریک تھیں...... معصوم، بے گناہ اور نہتے لوگوں کا قتل کب تک ہوتا رہے گا۔ دہشت گردی اور موت کا نقاب کب تک پہنے رہنا ہوگا۔ ہم لڑنا نہیں چاہتے ہیں، ہم دہشت گرد نہیں ہیں، ہم یہ کتنی بار کہیں کہ ہمیں بھی امن وسلامتی چاہیے، مگر ووٹوں کی سیاست کے ٹھیکے داروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ میڈیا ہمیں دہشت گرد، ملک دشمن کیوں بتا رہا ہے؟ ہماری حق باتوں کو کیوں نہیں نشر کر رہا ہے؟ چلاتے ہوئے گروہ، فوج اور پولیس کے سائے میں آتے جاتے رہنما، بے بسی کے عالم میں، غصے سے، نفرت اوڑھتے بچھاتے ہوئے جان دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم اپنی سرزمین پر ناپاک وجود نہیں برداشت کریں گے، اپنا فیصلہ ہم کریں گیں، ہم کریں گیں۔ ایک جنون، ایک آگ پھیلی ہوئی چہار سو وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہیں کہیں کے ظلم وستم اور درندگی دیکھ کر وہ بھی رو اٹھتا، انسان کا دکھ درد، انسان ہی تو محسوس کرتا ہے اور جو احساس کی روشنی سے خالی ہو اس کو انسان نہیں کہنا چاہیے، وہ کشمیریوں کے جذبات اور احساسات کو خوب سمجھتا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ذمہ داریاں اور شانتی مشن کو اچھی طرح نبھاتا۔

دشمن تاک لگائے بیٹھا ہے کہ چوک ہو تو بیروزگاروں کو کام دے کر توڑ پھوڑ، فسادات شروع کروایا جا سکے، اندھے نعرے دے کر بے کاروں سے کام لیا جا سکے اور

پھر بھوک تو اچھے اچھوں کا ایمان برباد کر دیتی ہے، رہنماؤں کے ذہنوں میں یہ موٹی بات کیوں نہیں آرہی ہے؟ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں مگر عوام کے تو خالی ہیں۔

روتے ہوئے بیمار بچے، بیوی، ضعیف ماں باپ، پڑھائی اور کپڑوں کو ترستے بھائی بہن، چوپٹ کاروبار، دور دور تک مدد نہیں، مستقبل نہیں، ہر وقت بھوک کا احساس، تو انسان ایسے عالم میں کیا سوچے گا، اور کیا کرے گا؟

وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ ایک انسان کو زندہ رہنے کے لیے کیا اور کتنا چاہئے؟ انصاف کی رو سے کوئی تو نام دینا پڑے گا............وہ اپنے اندر کے انسان، جاگتے ہوئے انسان سے لڑ رہا تھا............وہ روتے ہوئے بچوں کو اکٹھا کر جب پیار کرتا تو اس کے اور دیگر ساتھی منع کرتے کہ یہ سانپ کے بچے ہیں، جب وہ ڈری، سہمی بچیوں، خواتین کو دلاسا دیتا کہ اب آپ محفوظ ہیں لڑکا ہمارے پاس، لڑکی ہم نے چھڑا لی ہے، مت گھبرائیں دن رات ہم حفاظت میں مصروف ہیں تو تھوڑی دیر کو فضا بدل جاتی اور ان سبھی کی نگاہوں میں ملا جلا خوف و اطمینان وہ محسوس کرتا ہے اور ان کا اظہار باتوں سے بھی ہوتا تھا۔ یہ لمحات دیکھ کر اور سن کر اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا تھا۔

مگر یہ وقت زیادہ دیر تک اس کا مقدر نہیں ہوتا۔ گولی بارود کی بھیانک بھیانک آوازیں اور پھر جان لیوا خاموشی کے بیچ وہ پھر اپنے مشن پر نکل پڑتا تھا۔

وہ یہ بھی سوچتا کہ جوان نسلیں اور قومی پیسہ برباد ہو رہا ہے کتنا اچھا ہوتا کہ ان سب کا جائز مصرف ہوتا۔ ترقی، خوش حالی اور انسانی قدروں کی بحالی میں یہ ہاتھ، ذہن اور پیسہ لگتا، کتنا اچھا ہوتا مگر یہ اس کا خواب تھا۔ سچ تھا سامنے سے آتی ہوئی گولیاں، بارود سے تباہ ہوتی لاریاں اور مرتے شہید ہوتے لوگ۔ جیل خانوں میں دم توڑتی ہوئی نوجوانیاں، اجڑتے گھر بازار.... بھیڑ، احتجاجی جلوس اور جلسے، عمارات اور سڑکوں کی بربادی، آہ و فغاں میں ڈوبے ہوئے انسانی چہرے، سینہ کوبی میں مصروف عورتیں، بچے، مارتے پیٹتے اور گولیاں داغتے ہوئے حفاظتی دستے، پولیس اور ملٹری کے

بوٹوں سے گونجتے گلی کوچے اور وادیاں، کرفیو سے خاموش مفلوج آبادیاں.......

کتنا اچھا ہوتا کہ یہاں بھی امن واماں ہوتا، خوش حالی اور فراوانی ہر سمت ہوتی، اور خوف کا نام ونشاں نہ ہوتا۔ کیا پہلے ایسے ساز گار حالات نہیں تھے؟....... تھے تو من موہنی وادیاں گواہ ہیں کہ ان کے دامن میں سیلانیوں کا اژدہام ہوتا اور یہاں کے محنت کش مہمان نواز کشمیری ان کا خیر مقدم کرتے، وادیوں کے قدرتی مناظر کی سیر کرا کے اپنی معاش حاصل کرتے، امن وچین کے نغمات گونجا کرتے تھے مگر موجودہ حالات کا زہر اندر اور باہر تک پھیلا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ سوچتا اور سوچتا رہتا کہ آخر کب تک احتجاج چلتا رہے گا، خونِ بے گناہ بہتا رہے گا، آج نہیں تو کل، آنے والی سمجھ دار نسلیں اس بات کو سوچنے اور غور وفکر کرنے پر مجبور ہو اٹھیں گی، ہمیں اب امن، اطمینان وسکون ہر حالت میں چاہئے معاشی خوشحالی پر ہمارا اور ہمارے اپنے نونہالوں کا بھی حق ہے مگر یہ نئی کرن کب نمودار ہوگی؟...

اسی پیچ وخم کے درمیان، وہ ہر مورچے پر کامیاب ہوتا رہا۔ امن کا ماحول بنا تا رہا اور دھیرے دھیرے حالات ساز گار ہو اٹھے۔ آخر محنتیں کب تک اپنا جوہر عیاں نہ کرتیں؟

وادی کے لوگوں کو اپنی رائے اپنا ووٹ ڈال کر، اپنی حکومت بنانے کا وقت مقرر ہوا تھا مگر شر پسند عناصر آج بھی اپنی حرکتوں سے پیچھے نہیں تھے، فوج اپنا کام کر رہی تھی کہ اچانک اس کو ایک تار ملا۔ تار اس کی اپنی ماں کا تھا۔

بیٹا تم کو دیکھے ہوئے کئی سال ہو رہے ہیں، میں بیمار ہوں، تمہارا لڑکا بھی پاپا، پاپا پکارتا رہتا ہے، میرا اچل چلاؤ بھی نزدیک لگتا ہے، چھٹی ملے تو فوراً آجاؤ.....تمہاری اپنی ماں۔

پھر وہ تار کی گہرائیوں میں غرق ہو گیا۔ اس کو بیتے ہوئے پل یاد آنے لگے، جہاں ماں اور اس کا اپنا پیار تھا۔ شادی اور دوستوں کی محفلیں، گھر بازار بچپن اور بابو جی ایک کے بعد ایک خوش رنگ مسکراتے چہرے سامنے آتے گئے۔

وہ چھٹی لے کر خوشی کے ترانے گاتا ہوا، اپنے شہر جانے کی تیاریوں میں

لگ گیا۔

ایک مقرر وقت پر اس کی گاڑی نے اس کو اپنے شہر پہنچا دیا۔ دل و دماغ میں مست ترنگیں دوڑ رہی تھیں اور وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جانے کو بے تاب تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر وہ ایک رکشہ پر سوار ہوا، گھر پہنچنے کے لئے کیونکہ اس کا گھر ریلوے اسٹیشن سے کچھ ہی دور پر تھا۔ اور صبح کے تقریباً چار بج رہے تھے، رکشہ ذرا ہی دیر چلا ہوگا کہ ایک موٹر سائیکل پر سوار دو جوانوں نے رکشہ روک لیا۔ اندھیری رات میں بول گونج رہے تھے کہ تیرے پاس جو کچھ بھی ہو نکال، نہیں تو خود کو مرا سمجھ، ان کے ہاتھوں میں ریوالور وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ تھی، میں فوج کا افسر ہوں، اب تم لوگ مجھے گولی مارو گے۔

جلدی مال نکال...نہیں تو تو جو بھی ہو صبح کے لٹیروں کا لہجہ خوف ناک ہوا تھا۔

''جاؤ، میں نہیں دیتا،، یہ سن کر لٹیرے اس کو رکشہ سے کھینچنے لگے تو وہ بھی بھڑ گیا اور اسی درمیان ریوالور چل اٹھا اور گولی سیدھے فوجی کے سینے میں پیوست ہو گئی، گولی اپنا کام کر چکی تھی۔ ساری خوشیاں تمنائیں زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ دوسرے دن کی اخبار کی سرخی کچھ اس طرح تھی۔ ''کشمیر کی سرحدوں پر دشمنوں کی گولیاں جس کا بال بھی گھائل نہ کر سکیں اس کو اس کے اپنے شہر میں صبح کے لٹیروں نے ہلاک کر کے سارا سامان لوٹ لیا، فوجی اپنی ماں کے تار پر چھٹی لے کر اپنے گھر جا رہا تھا۔''

ماضی کا داغ

فرصت کے لمحات اگر میسر آ جائیں تو قیمتی ہوتے ہیں۔ اس رواں دواں زندگی میں تھکن تو انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ اور اگر اتفاق سے چند لمحے مل جائیں تو اس کو خوب سے خوب تر بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

میں بھی ان لمحات میں اپنی سابقہ زندگی، پر کیف ایام سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا تا کہ اس کی دل فریبی سے میرے مردہ جذبات کو جلا ملے اور مجھ میں زندگی کی بھرپور رعنائیاں ظاہر ہو جائیں اور میری لاش جس کو روایت کے تحت دفن کر دیا گیا ہے اس سے الگ ہٹ کر کس طرح جی سکوں گا۔

زندگی کے ہر نشیب و فراز میں ہمارا ماضی سائے کی طرح، ہر پل آئنے کی شکل میں موجود رہتا ہے اور کامیابی کی ضمانت بن کر ترقی کے راستے استوار کرنے میں مدد کرتا ہے اور ایک میں ہوں کہ صبح سے شام تک معمول کے مطابق ایک ہی کام میں مصروف رہتا ہوں۔

بالکل آٹو میٹک مشین کی طرح ایک ہی کام کو انجام دینا۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ میں اپنی یاداشت کھوتا جا رہا ہوں۔ بس ایک ہی کام کے علاوہ میرے دل و دماغ میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد آج مجھے احساس ہوا کہ پورے بیس سال سے میں ایک ہی محور پر گردش کر رہا ہوں۔ ایک ہی دائرے میں گھوم رہا ہوں اور تقریباً خود کو بھول چکا ہوں۔ آج محسوس ہوا کہ میں بیس سال سے سوتا رہا ہوں۔ کتنا خوبصورت تھا میرا

ماضی۔ حسین یادیں دل میں اضطراب کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ یہ مجھے آج کیا ہوتا جارہا ہے۔ دل ودماغ میں یہ کیف وسرور کی کیفیت کیوں طاری ہوتی جارہی ہے؟ شاید اس لیے کہ میں آج فرصت کے لمحات کا استعمال اپنی چاہت اپنی پسند اپنی ذہنی تسکین کے لئے کرنا چاہتا ہوں آج کتنا خوش ہوں اس کو یوں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جیسے شبنمی گھانس پر ننگے پیر چلنے سے اس کی فرحت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

آج میرے سینے میں وہ جا گا ہے جو بچپن ہی میں میرے دل کی امانت بن چکا تھا۔اس کی ٹیس میں مجھے وہ لذت ملی لیکن مجھے ایسا مرہم نہ مل سکا تھا جو میرے زخموں کو بھر دیتا۔ رفتہ رفتہ اس کا زہر میرے پورے وجود میں سرایت کرتا گیا اور میں اصلی ہیت کھوتا گیا۔اپنے وجود کی اصل رنگت.........

لیکن میرا ماضی سفید نہ بن سکا میں مضطرب ہو کر اپنے پائیں باغ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ایک عجیب اضطرابی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ میں سگار سلگائے چلا جا رہا تھا، بجائے آرام کے بے کلی اور بڑھتی جارہی تھی سردی پورے شباب پر تھی مگر اس کے باوجود میرے ماتھے پر پسینہ رواں تھا۔ جسے میں اپنے رومال سے خشک کرتا جارہا تھا۔میرے ماضی کے کینوس پر ایک داغ دیکھ کر میں چونک سا پڑا لرز سا گیا۔ یا خدا اتنی بڑی بھول، میرا سر چکرانے لگا، دل بیٹھنے لگا،نبض کی رفتار سست پڑنے لگی، سرد چاندنی بھری رات گہری نظر آنے لگی، ہر سمت سفیدی ہی سفیدی چھانے لگی۔ پھر رنگ برنگ شعاعوں نے اپنا ریشمی گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ایک عجیب وغریب کیفیت مجھ پر چھانے لگی۔ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی دوسرے قصبہ میں آگیا ہوں۔

میں کب تک اس کیفیت سے ہمکنار رہا کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں بس میری گھڑی صبح کے چار بجا رہی تھی اور میں باغ کی مخملی گھانس پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ خون منجمد ہو گیا ہو اور اب جان نکلی کہ تب جان نکلی۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی میری جانب تیز تیز قدموں سے بڑھتا چلا آرہا ہے میں ابھی صرف اس کا ہیولا ہی دیکھ پارہا تھا۔جس کے نقوش سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ جب وہ ہیولا قریب آیا تو اس نے مجھے اٹھایا، سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں گر پڑا تو اس نے مجھے اپنی

پیٹھ پر لاد کر اٹھالیا مجھے میرے کمرے میں پہونچا کر وہ کہیں چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گرما گرم کافی کا پیالہ تھا۔ مجھے اپنے بدن میں گرمی محسوس ہونے لگی۔ میں اس ہیولا کو پہچان گیا تھا۔ وہ میرا پڑوسی تھا لیکن جس کے نام اور کام سے میں آج تک واقف نہ ہو سکا تھا صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ میرے بغل والے مکان میں رہتا ہے میں تشکر بھرے انداز میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ایسی مسکراہٹ جو کسی کی مدد کر کے انسان محسوس کرتا ہے۔

پھر میں یکا یک رونے لگا اور ساتھ ہی چیخنے بھی لگا کہ میں گناہ گار ہوں، بہت بڑا گناہگار میں نے اس کی مدد کیوں نہیں کی؟ میں انسانیت کا دشمن ہوں تم کو میری مدد نہیں کرنی چاہئے مجھے اس حالت میں مر جانے دیا ہوتا۔

اور وہ کہہ رہا تھا کہ ''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کیوں رو رہے ہیں آپ اپنے آپ کو کیوں گناہ گار تسلیم کر رہے ہیں''۔

لیکن میں اس کو کس طرح بتاتا کہ میرے خوبصورت ماضی میں ایک یہ بھی داغ ہے۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں جب میں ہاسٹل میں رہتا تھا تب میرے بغل کے کمرے میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ ایک رات وہ بہت بیمار پڑا۔ اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا لیکن اس کی میں نے کوئی مدد نہیں کی بلکہ دوستوں کی رنگ و نور کی محفل میں کافی رات تک ڈوبا رہا اور جب صبح کو واپس آیا تو میرے بغل کے روم کا وہ لڑکا مر چکا تھا۔

اپنی مٹی کی مہک

اے بیتے ہوئے کل تیرے علم میں تو سب کچھ ہے۔ میں اپنی روداد حیات ترتیب دے رہا ہوں۔ میرے آباواجداد شہر لکھنو کے قصبہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ کاکوری کے، جو علم وادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور وہاں روحانی آسودگی کے لئے فیض کا دریا روضہ کاظمیہ ہے۔ جنگ آزادی میں اپنی ایک الگ چھاپ بھی۔

کاکوری کے چودھری محلے میں چو بڑے نام کے ایک مکان سے ہمارا سلسلہ نسب وحسب شروع ہوتا ہے اور اس سے پہلے ولی نگر تھا۔ زمینداری کا زمانہ تھا۔ سخت محنت مشقت کے بعد پیٹ کو روٹی نصیب ہوتی تھی خوشحالی کیسے آئی؟ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ بزرگوں نے کپڑے کی تجارت شروع کی۔ ابھی راحت وسکون کی سانسیں میسر نہ آئیں تھیں کہ سرپرست اعلیٰ مالک حقیقی سے جا ملے۔ گھر کی ذمہ داری دوسرے افراد پر آ گئی۔ عجیب وغریب حالات رونما ہوئے جن کی یادیں آج بھی خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ کتنا پاکیزہ ماحول ہوا کرتا تھا۔ معاشرتی پس منظر میں آداب واخلاق کے وہ مناظر بھلائے نہیں جا سکتے۔ بزرگوں کی صحبت اور ان میں یہ جذبہ کہ وہ نئی نسلوں کو کیا کیا سکھا دیں اور کیا کیا دے دیں۔ رواداری اور دوسروں کی بھلائی میں ہمہ وقت لگے رہنا ہماری قدیم تہذیبی روایت تھی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بیماری کے اژدہے نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ اپنے بھی پرائے نظر آنے لگے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وطن عزیز کو چھوڑنا پڑا۔ دل سے کوئی بھی اپنے وطن سے الگ ہونا نہیں چاہتا۔

کچھ پانے کی خواہش کچھ بننے کی لگن ہمیں کانپور کھینچ لائی۔ پردیس کا اجنبی ماحول۔ الگ الگ نظریات کسب معاش کے مختلف طریقے۔ اپنائیت ومحبت کے معنی ومفہوم بدلے ہوئے دکھائی دیئے۔ نئے طور طریقے اپنانے میں وقت لگا۔ ہر نقطہ سمجھا۔ پھر دھیرے دھیرے عمل کی منزل پر راہ بنتی رہی۔ ایک سے دو، دو سے تین اور تین سے نجانے کتنے مواقع آتے رہے اور فیض پہنچاتے رہے۔

اسی کانپور نے پھر وہ مقام بھی دیا کہ اطراف میں شناخت ہونے لگی۔ ہر محفل میں ہمارا ذکر ہونے لگا۔ ہم اپنی قدیمی روایت سے لپٹے ہوئے غریب، نادار اور مجبور لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ ترقی ہمارے قدم چومتی رہی۔ عزت وشہرت اور دولت سب کچھ خدا نے ہمیں عطا کر دیا۔ وطن سے دور رہ کر بھی یاد وطن جان لیوا اداؤں کے ساتھ آتی رہی۔ مگر ماحول وحالات کے مطابق دل مسوس کر رہ جاتے۔

میں کبھی کبھی یہ سوچتا کہ شاخیں تو میری بہت سی ہو چکی ہیں اب چلا جائے بچپن کے دوستوں کے درمیان دلی چین وسکون کے لیے وہ بھی شاید میری طرح پکے آم ہو گئے ہوں۔

میری ایک شاخ مجھ سے عجیب طرح کے سوالات پوچھا کرتی۔ میں کبھی بھی ان سوالوں کا جواب بہت ہی زندہ دلی اور زندگی سے بھرپور لب ولہجہ میں دے دیتا ہوں اور کبھی کبھی خاموش سا ان سولوں کے درمیان الجھ جاتا ہوں۔ ان میں جسس ہوتا۔ اپنے لوگوں کے بارے میں جاننے کی تڑپ بھی۔ میں اپنی یادوں کو یکجا کرنے لگتا ہوں اور اس درمیان ہی دوسرا سوال سامنے آجاتا ہے۔ میں ان کی بے صبری پر ہنس پڑتا ہوں یہ سوچ کر کہ میں نے بھی اس طرح کے سوالات کئے تھے بچپن میں۔ جہاں کی مٹی سے میرا خمیر بنا تھا۔ اس کی یاد مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ اس مٹی کی سوگندھ سے میں بیقرار ہو جاتا ہوں جیسے گھر کے درو دیوار مجھے اپنی طرف کھینچ رہے ہوں اور میں ان کی آوازیں سن رہا ہوں۔ احساس کی وادی جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور زندگی کی بے رحم بیڑیاں سارا درد وکرب چپ چاپ پی اور مضبوط ہو جاتی ہیں اور وہ بوڑھا نیم کا پیڑ، چھپر کے نیچے پڑا پرانا تخت اپنی تکمیل نہ ہونے پر اپنوں کی بے حسی پر خون کے آنسو

بہاتا رہتا ہے۔

میں کیا کروں؟ جب یہ خیال آتا ہے تو کوئی غیبی قوت کہتی ہے، چل اپنے وطن، تجھے وہاں کی پاک مٹی بلا رہی ہے۔ تیرے کچھ تو عزیز واقارب آج بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ تیرے آنے پر ازحد خوش ہوں گے اور راتوں میں جاگ جاگ کر تجھ سے پرانی بچپن کی اور پھر تیرے بعد کی کہانی سنیں گے، سنائیں گے اور بتائیں گے۔ دل کو راحت دماغ کو چین وقرار ملے گا۔ تیری آمد پر خوشی کا اظہار کریں گے۔ یہ آم کے باغات اور جامن کے درخت جھوم جھوم کر تیری آمد کا استقبال کریں گے تو اب چل۔ زیادہ مت بے چین ہو۔ اپنی بے قراری کو منزل عطا کر اور زاد سفر اٹھا۔ پھر ان کی آرزو اور یادیں مجھے روک نہ سکیں اور میں چل دیتا ہوں تمام رکاوٹوں کو روندتا ہوا۔ دل تڑپ رہا ہے کس طرح درگا گنج آجائے اور وہاں سے پیدل یکہ پر نہیں پیدل ہی پکی سڑک پر چل دوں۔ سڑک کے دونوں جانب باغات کے سلسلے سے طرح طرح کی خوشبوئیں ہوا میں تحلیل ہو کر دل ودماغ میں نشہ طاری کر رہی ہیں۔ پھر میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے قلعہ میدان پہونچتا ہوں۔ ارے یہ تو ہمارے وہ ہیں ہائے بالکل سفید ہو گئے۔ شاید مجھے پہچان بھی نہیں پائے اور میں نے سلام داغ دیا۔ آپ نے مجھے پہچانا؟ تھوڑی دیر رکے اور پھر ارے میرا بیٹا کہتے ہوئے چمٹا لیا۔ ان کے سینے سے لپٹ کر مجھے بہت طمانیت کا احساس ہوا۔ پرانا دبا ہوا پیار کا سوتہ پھوٹ پڑا جس کے نشہ سے میں سرشار ہوتا گیا۔

میں جب رات کا کھانا وغیرہ کھا کر چارپائی پر لیٹا تو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ میری شاخیں ٹہنیاں پتیاں سب موجود تھیں۔ ہر شخص اپنا سوال الگ الگ کر رہا تھا۔ کافی رات بیت چکی تھی لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے رات ٹھہر گئی ہو۔ میں صبح ضروریات سے فارغ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دوست واحباب کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ کتنی خوشی ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا اور جب میں نے ان سے کہا کہ میں جانا چاہتا ہوں تو ایک شور سا اٹھا۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ ہم لوگ جانے نہیں دیں گے میں نے کہا بھائیو! میں اکیلے گھومنا چاہتا ہوں۔ اپنی پرانی یادیں گھوم گھوم کر تازہ کرنا

چاہتا ہوں۔ میں جا نہیں رہا ہوں۔ اس مٹی کا حق کہ جہاں میں پیدا ہوا ہوں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی فضا میں حسین یادوں کے درمیان اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں اس کی گلیاں اور گلیوں کی دھول، میرا آنگن، تالاب، درخت، نہریں میرا سب بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔

پھر میں گھومنے لگا سب سے ملتا رہا اپنی داستان، اپنی مصروفیت کو بتا تا رہا کہ ایک جگہ میرے قدم خود بخود رکنے لگے۔ سینے میں درد وا حساس اٹھ آیا اور میں بیقراری سے اپنے وجود کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے آبائی قبرستان کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک جانب بہت ہی پرانا پیڑ کھڑا ہوا تھا جس کی جڑیں اوپر نکل آئی تھیں۔ بزرگی اس کی ہر شاخ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ دوسری جانب ایک بوسیدہ سی مسجد تھی۔ میرے ذہن میں طلاطم برپا تھا۔ ایک ایک چہرا شفقت بھری عنایتوں کے ساتھ ذہن میں ابھرنے لگا مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہونے لگی۔ ایک ایسی مستی جس میں ہوش وحواس نہ رہے وہ سارے مشفق چہرے مجھے پیار کرنے لگے، مجھے امن وسلامتی کی دعائیں دینے لگے اور میرے ہاتھ بے اختیار دعا کے لئے اٹھ گئے۔ میرے پاس جو بھی الفاظ تھے سب ادا کر دئے اور آخر میں رب کائنات سے اتنا کہا کہ میں تو تیرا حقیر گناہ گار بندہ ہوں تو غفور الرحیم ہے میری دعا کو قبولیت کا درجہ عطا فرما اور میں جب قبرستان سے رخصت ہوا تو بہت خوش تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ حضرت آدم، ماں حوا سے دنیا میں مل کر خوش ہوئے تھے۔

میرے چہرے سے عیاں ہوتی ہوئی خوشی کو دیکھ کر میرے احباب کہنے لگے کہ تمہیں آج خزانہ مل گیا ہے کیا؟ جو اس قدر خوش ہو۔ میں نے ان لوگوں کو پوری روداد سنادی تو وہ لوگ بھی سن کر خوش ہوئے۔ اپنوں سے مل کر بھلا کون خوش نہیں ہوگا؟......

دن رات بیتتے رہے اور ہم پرانی یادوں کی چادر تان کر جیتے رہے صرف اس آس میں کہ ہماری شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں بھی اپنے آبا واجداد کو اور اپنی مٹی کو اسی طرح خراج عقیدت پیش کریں گی۔

☆☆

اب بھی وقت ہے

بابا آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں؟
لیکن بیٹے میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو تمھاری سمجھ سے بالاتر ہے؟ یہی کہ ہمیں امن وامان سے رہنا چاہیے۔
ہاں، بیٹے۔ یہ بالکل سہی ہے۔
کیا آپ کو جلتے ہوئے مکانات دکھائی نہیں دے رہے ہیں؟
دیکھ رہا ہوں، مکانات ہی نہیں انسانوں کو جلتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہوں اور ان کی دردناک آوازیں بھی سن رہا ہوں۔
پھر بھی آپ کہہ رہے ہیں ہمیں امن چاہیے؟
میرے بچے ابھی تمہاری عمر ہی کتنی ہوئی ہے بمشکل ۸/۱۰ سال۔ میں نے تو ۷۵ بہاریں دیکھی ہیں۔ مگر تم کیوں امن کے نام پر نفرت کا اظہار کرتے ہو؟
بابا، میرے والدین، بہن، دوست واحباب، گھر بار سب لوٹ لیا گیا۔ آگ لگا کر مٹی کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ میں جلے ہوئے ملبے میں یہ بھی نہیں پہچان سکا کہ کون میری ماں ہے؟ کون میرا باپ؟ بھائی، بہن اور دوست......؟ میں وہ منظر نہیں بھول سکتا ہوں۔
میرے معصوم بیٹے ......صبر کر ہمت سے کام لے۔
نہیں...... مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔ مجھے نصیحت بھی نہیں چاہئے۔ مجھے تو ان صورتوں سے انتقام لینا ہے۔ جنھوں نے میرے ہنستے کھیلتے خوشیوں سے بھرے گھر کو برباد کر دیا ہے۔ اب تو میری اپنی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ انتقام.....

............انتقام۔

ابھی تم چھوٹے ہو، تمہارے دل و دماغ میں اس قدر نفرت اور انتقام کا جذبہ بھرا ہوا ہے جو تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔ یہ تم کو اور تمہارے ذہن کو برباد کر دے گا۔

بابا، میں آباد بھی نہیں ہونا چاہتا۔ کیا رکھا ہے تمہاری اس قاتل اور سنگ دل دنیا میں؟ جہاں خوشیاں جلائی جاتی ہوں۔ کلیوں کو بلا کھلے ہوئے ہی مسل دیا جاتا ہو۔ معصوم بچوں کو درندگی سے دو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہو اور تم ہو کہ اسی دنیا میں امن قائم کرنے کی بات کرتے ہو۔ بزدل ہو، ڈرپوک ہو۔ مجھے بھی اپنے بے حس سانچے میں ڈھال کر مردہ کر دینا چاہتے ہو۔ میری عمر کہتے ہو کم ہے، مجھ میں پہاڑوں کو چکنا چور کر دینے کی قوت ہے۔ میں تمہاری نگاہ میں بچہ ہو سکتا ہوں مگر میں خود کو بچہ نہیں سمجھتا ہوں۔

۷۵ سال کا بوڑھا اس دس سال کے بچے کو یکلخت تکے جا رہا تھا۔ اس وقت بچے کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ عمل کی دھن اس پر سوار ہے اور نتیجے اس کے سامنے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

آخر اس دس سال کی پڑھنے لکھنے والی عمر میں قتل و غارت گری کیوں کر اس پر سوار ہو چکی ہے؟ اس نے اپنی زندگی کا مقصد کیوں خون بہانے کے لئے بنا لیا ہے؟ یہ ننھی سی کلی کیا ہمارے ملک کے بہترین مستقبل کے لئے ضروری نہیں ہے؟

رام اور رحیم کے ماننے والو! ذرا سوچو تو سہی ......اب بھی وقت ہے۔!؟!

☆☆

فیشن یافتہ

انٹرنیشنل شہرت کی مالک، اپنی بہترین کارگزاری سے ہر دل عزیز تھی ''کیزا ایڈورٹائیزنگ آرگنائزیشن'' .... کسی بھی چیز کی مقبولیت کے لئے لوگوں کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔ کیزا، کیزا۔ اسی آرگنائزیشن میں مونالیزا تھی جس کا کام لوگوں کو دلنشیں انداز میں متوجہ کرنا، سرخ گلابی چہرا، سحرزدہ آنکھیں، اسٹائیلش سے سنوارے گڑیا نما بال، قیامت خیز جسم اور لباس، ایسا معلوم ہوتا کہ چاند اب نکلنے والا ہے۔ نمودار ہونے کی چاہ میں بس ہر کوئی دیکھتا ہی رہ جاتا تھا شفق کی دل فریبی...... یوں تو اس کے عاشقوں کی تعداد لمبی تھی جو کوئی دیکھتا تمنا انگڑائی مار کر اٹھ کھڑی ہوتی لیکن نو لفٹ کا بورڈ دیکھ کر صرف آہ ہی حصہ میں آتی تھی۔

مونالیزا بڑے پروقار انداز میں چلتی ہوئی گیلارڈ کلب کے ڈائننگ حال میں داخل ہوئی۔ ہلو باس، ہاؤ آر یو؟ ہیلو مونا، کوائٹ ویل.... بڑی دیر کر دی۔ یس باس تھوڑی دیر ہو گئی...... کیا بات ہے آج کام میں موڈ نہیں لگ رہا ہے۔ مونا ٹھہر کر بولی طبیعت نہیں لگ رہی ہے۔ کیوں؟ پتا نہیں...... اچھا چھوڑو دیکھو آرکسٹرا شروع ہو گیا ہے آؤ ڈانس کریں، نہیں باس پھر کسی دن.... پھر کسی دن کیوں ابھی، اب آؤ نا، مونا شکستہ انداز میں اٹھی۔ اپنے باس کی بانہوں میں سما کر رقص کرنے لگی، بڑی قیامت خیز میوزک تھی جذبات کا طوفان گرم ہو ہو کر گرفت میں مضبوطی لا رہا تھا، ہر طرف سرور چھایا ہوا تھا۔ مدہوش فضا، سرورانگیز جوڑے اپنے اپنے ارمان کی پرورش کر رہے تھے اور مونالیزا اپنے باس مسٹر جان کی بانہوں میں سمائی ہوئی خود کو قفس میں بند برڈ سمجھ رہی

تھی۔اس کا دماغ سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں ہی پہلے کی بات ہے وہ اور اسمتھ آپس میں کسقدر محبت کرتے تھے، ایک بھی پل جدائی گوارہ نہیں تھی۔ اسمتھ جب فیکٹری چلا جاتا تو وہ اس کی فوٹو سامنے رکھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی اور شام کو اسمتھ اپنے گھر واپس ہوتے ہوئے میرے لیے ہر روز تازہ پھول کا گلدستہ لاتا تو فرط مسرت سے اس کے گلے کا ہار بن کر بے تحاشہ چومنے لگتی تھی پھر اس کے چوڑے سینے میں اپنا سر چھپا کر ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتی تھی۔لیکن اچانک ہی میری ماں ایک حادثے کا شکار ہوگئی اور مجھے اکیلا چھوڑ کر صدا کے لئے بچھڑ گئی اور میرے لیے رہ گیا ماں کا قرض و اسمتھ کا پیار۔میری ماں بھی ایک ماڈل گرل تھی مجھے اس کا قرض اتارنے کے لئے کیزا میں کام کرنا پڑا۔اسمتھ کہتا ہی رہ گیا مگر میں نے ایک نہ مانی اور میرے و اسمتھ کے درمیان نزدیکی دوری میں بدلنے لگی۔میرے اس پیشے میں آنے سے تقدیر چمک اٹھی مسٹر جان کی۔دن رات کی محنتوں سے آخر کار میسر ہوئی بے پناہ کامیابی۔اب کیا کچھ نہیں ہے میرے پاس سب کچھ تو ہے۔مسٹر جان بھی تو مجھے خوب چاہتے ہیں انہوں نے میرے لئے کتنی کوششیں کیں انہیں کاوشوں کے صدقے یہ شہرت، دولت اور عزت ملی ہے، پہلے میرے پاس کیا تھا کچھ بھی تو نہیں .....تو پھر آج اسمتھ نے مجھے سب کے سامنے کیوں ذلیل کیا اس نے کیوں کہا مونا تجھے سچا پیار نہیں ماڈل جیسا پیار کرنا آگیا ہے تو ہر روز ایک نئے انداز نئے فیشن میں اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے اور ضرورت پوری ہونے کے بعد اتار پھینکتی ہے تم ماڈل گرل نہیں خود ایک ماڈل ہوگئی ہو جس کے اندر نہ محبت ہے نہ احساس۔ماڈل ہے صرف ماڈل۔

اچانک ہی ایک چھناکے کے ساتھ آرکسٹرا بند ہوگیا۔سانسوں کا زیر و بم سنبھالتے ہوئے ہر ایک جوڑا میز پر آنے لگا۔مونا لیزا بھی بے جان سی گھسٹتی ہوئی مسٹر جان کے ساتھ آئی۔

"کیوں اداس ہو مونا؟ کتنا رومانٹک گیت تھا اور تم کھوئی کھوئی سی"۔

مسٹر جان نے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ ماڈل اور انسان میں کیا فرق ہوتا ہے''

مونالیزا گھبرا کر بولی۔

''ابھی تک تم کیا سمجھ رہی تھی''، مسٹر جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہی کہ انسان حساس ہوتا ہے اور ماڈل بے جان کھلونا جو وقت اور حالات کے پیش نظر انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے''۔

مونا روانی سے یہ کہہ گئی۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہی ہے مگر میری نظر میں ایسا نہیں''۔

مسٹر جان سنجیدہ ہو کر بولا۔

''وہ کیوں کر؟'' مونا نے پوچھا۔

''ایسا اس لئے کہ ہمارا کام ہے دنیا کو اپنی طرف راغب کرنا، نت نئے روپ و انداز میں، آج کا ماڈل اور انسان دونوں احساس سے خالی ہوتے ہیں ان کا ایک ہی کام ہے۔ وہ ہے موسم کی طرح ہر پل بدلتے رہنا اور یہی ہمارا پیشہ ہے۔''

اپنے باس کا جواب سن کر مونالیزا کا چہرہ شادابی کی رنگت سے کھل اٹھا اور وہ مسکرا کر اپنے سامنے لگے ایڈورٹائزمنٹ بورڈ کو دیکھنے لگی جس پر لکھا تھا کہ ''جوان دل کی دھڑکن خوبصورتی کا راز صرف کیزا... کیزا... کیزا۔

زخم زخم حصار

میں اپنے وجود کے شعلہ زار میں تڑپ رہا ہوں۔ میرے سامنے ہیں میری زندگی کے پہلو جو میرا مقدر بھی اور میری انا کا درد بھی۔

تم کو کیا معلوم کہ اس لباس میں مَیں کتنا کرب واضطراب رکھتا ہوں!

میرے اردگرد کا ماحول گواہ ہے کہ میں نے آج تک اپنی بنائی ہوئی حدود نہیں توڑیں۔ خود کو ہر پل ہر لمحہ کچلتا رہا، چونکتا رہا۔............ مگر.........

میں تو وہی ہوں میری کائنات بھی وہی ہے۔ درودیوار، رنگ روپ میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیا۔ اپنی زندگی کے مصروف ترین لمحات میں مجھے صرف اور صرف اپنے وجود کا لپکتا ہوا شعلہ ہی ملا۔ بجائے فرحت وشادمانی کے روح کا بل کھاتا تڑپتا پیکر ہی دکھائی دیا۔

میں کبھی کبھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ کاش میں اپنے خوددار ذہن کو تبدیل کر پاتا تو اس طرح کے گھائل وجود کی پاداش سے بچ جاتا بلکہ میرا تصوراتی مرکز جو میری پر بہار امید کا مرکز بھی ہے کیوں کہ اس کے دامن کی رنگت میں بے نوری کا زہر ہوتا، اس کے دریچوں سے میری معصوم تمنائیں اور خواہشیں اپنے رنگوں کے جوہر بکھیرتی ہوئی تصوراتی جنت کا نقش لئے ہوتیں.........کاش.........جب میں بادلوں کی آواز سنتا ہوں تو مجھ پر بے خودی کا احساس طاری ہونے لگتا ہے اس کی آواز میں بلا کا درد، بلا کی پیاس موجود ہوتی ہے وہ اپنے جذبات نچھاور کر کے راحت و آرام کے باب کھول دیتا ہے پھر بھی اس کے حصے میں پیاس ہی پیاس رہتی ہے۔ میں

جب بھی اپنی زیست کی چھاؤں میں بند کھڑکی کھول کر اس کی دردناک تباہی دیکھتا ہوں مسلے ہوئے پھول دیکھتا ہوں تو فوراً ہی ورق پلٹ دیتا ہوں مگر ایک ہی لمحے کے بعد پھر اپنے باب کو اپنی زندگی کی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے سینے سے لگا لیتا ہوں، اس کا خیر مقدم کرتا ہوں جو کچھ بھی میرے حصے میں تھا، مجھے ملا۔ میری خواہش سے کہیں زیادہ...... میری تڑپ سے کہیں زیادہ.......میں ممنون و مشکور ہوں اس نتیجے کا۔

غم کی چھاؤں میں کبھی کبھی میں اپنے آپ بہت فراخ دلی سے ہنستا تو کبھی کبھی درد کی بدلی بن کر میرے احساسات برستے، میں اس ہنسی اور برسات میں خود کو دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ سمجھتا۔ جس کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں..... مہربانیوں کی چادر اس درجہ تار تار ہو کر میرا مذاق اڑائے گی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، میرا تصور بھی کتنا چھوٹا تھا.........کیا یہ واقعی چھوٹا تھا؟ اب مجھے اس بات پر ہنسی کے ساتھ ساتھ رونا بھی آتا ہے اور احساس کی گہرائیوں میں ڈوب کر بھی تسکین کے کنارے نہیں پہنچ پاتا بلکہ کنارا اور دور دکھائی دینے لگتا ہے بیچ میں میرا وجود ہی ڈوبتا ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ایسے میں میں اور زیادہ بے چین ہو کر اِدھر اُدھر وادیوں میں بھاگنے لگتا ہوں..... یہاں تک کہ تھک کر گر پڑتا ہوں۔ مدلبوں پر رقص کرتے ہوئے اور کاری زخم عطا کر دیتی ہے صبح کی پاک کرنیں میرے پیاسے وجود کو سیراب کرتی ہوئی اپنی آمد کا اعلان کرتی ہیں اور میں پھر تر و تازہ ہو کر زندگی کے سراب کے پیچھے بھاگنے کو تیار ہو جاتا ہوں۔

روز خود کو تیار کرتا ہوں اور قربتوں کی سزا اپنے دامن میں بھر کر چل پڑتا ہوں۔ مسکراتی بل کھاتی بہاریں راستوں کو مہکاتی، دل میں اضطراب کے خزانے بھرتی ہوئی آتی جاتی دکھائی دیتیں ہیں مگر کس پر میرا حق ہے؟ یہ خیال قہر بن کر میرے پورے حساس وجود پر طاری ہو جاتا ہے۔ جوانی کا بوجھ، دوستوں کا مذاق، پڑوسیوں کا طنز، معاشرے کا سوال، دماغی الجھن، ناکامی اور کامیابی کے دلائل اور سب سے بڑی بات جان لیوا احساس۔

کیا یہ سب کچھ میرے ہی حصے میں آنا تھا۔ میں بھی تو مٹی کے خمیر سے پیدا ہوا ہوں، یہ تیروں کی بارش میری ہی جانب کیوں...... کیا میں ہی دنیا میں نرالا ہوں۔ ہاں میرے طور وطریق تو جدا ہو سکتے ہیں۔ میں ان تمام لوگوں سے الگ تو دیکھ سکتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ ان تمام باتوں اور اپنی اہلیت کی بنا پر میں منفرد ہوں۔ میرا نقطۂ نظر دوسروں سے جداگانہ ہو۔ یہ سچ بھی ہے لیکن ان تمام زخم لگانے والوں کی نظر میں زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ کام کرو یا نہ کرو.......... شادی کر کے بچے ضرور پیدا کرو کیونکہ اس سے سماج میں وقار بنتا ہے چاہے خود کو اور بیوی بچوں کو روٹیاں نہ مل سکیں۔ انجام کچھ بھی ہو مگر یہ تو ہونا ہی چاہیے، چاہے قرض ہو یا جائیداد بکے۔

لیکن تعلیم کا زیور اندھی تقلید کرنے ہی نہیں دیتا ذہن میں وہ جنگ چھڑتی ہے کہ رات دن کی تمیز ہی ختم ہو جاتی ہے۔ تقدیر اور تدبیر پر آ کر نگاہیں ٹک جاتی ہیں۔ زندگی کا اصل مقصد کچھ دیر کے لئے اپنا رخ پیش کر دیتا ہے۔ مگر ہُش ...... یہ نہیں، ٹھیک تو بس یہی ہے اس میں زندگی بہترین نوازشیں اپنے چہرے دکھاتے ہوئے، چھانے لگتی ہے اور سب کچھ بھول کر بس عیش وعشرت کے چند دن ہی یادگار بن کر دل کی دھڑکنوں کو بڑھاتے رہتے ہیں اور پھر شروع ہو جاتی ہے۔ ڈگر پنگھٹ کی.......... ڈھنگ رنگ ڈگر........

میں اپنی جگہ بہت ہی چابک دستی سے نپے تلے قدم رکھتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہوں، مسکراتے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے، ان کے چہروں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ بات کرنے کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ میں ان کے دکھوں کو سمجھتا ہوں مگر وہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ بھلا کیوں کر ہمیں بتائیں کہ ہم کو اپنی زندگی میں یہ تکلیفیں بڑھ چکی ہیں اس پر یہ کہ ہم اکیلے نہیں ہیں دکھ بانٹنے میں دونوں شریک ہیں۔ تم اپنی سناؤ۔ سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔ راتوں کی بے کراں تنہائیاں کچھ تو نصیحت کرتی ہوئی یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

یہ تمام باتیں جہاں روزمرہ کی زندگی میں ہوا کرتی ہیں۔ کیا چاندنی چاند سے

الگ رہ کر اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے۔نہیں نہیں.....کبھی نہیں۔

لیکن ہاں،ہم آسان باتوں کے لئے نہیں کہہ سکتے مگر زمین پر جو مخلوق رہ رہی ہے وہ اپنے آپ میں خود آئینہ ہے آپ تو میری طرف خود ہی صبح و شام آٹھوں پہر دیکھ رہے ہوں گے۔

مگر میں ان تمام باتوں کے باوجود اپنی منزل پر مسلسل نگاہ رکھے اپنے دل کو تڑپاتے ہوئے۔جذباتی حصار کو توڑ کر گھائل وجود کا بوجھ اٹھائے ہوئے اور اپنی انا کی تار تار چادر تانے ہوئے چلا جا رہا ہوں کیوں کہ میرے وجود میں اژدھام ہے،خوبصورت اور سلگتے ہوئے جذبات کا۔!
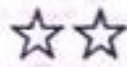
موقع اپنا اپنا

گھنا کہرا تھا اور رات کے تقریباً تین بجے ہوں گے۔ وہ پیدل چلا آرہا تھا اپنے گھر کی جانب، ٹرین الہ آباد سے چل کر کانپور کافی دیر میں پہونچی تھی۔ ایک نمبر پلیٹ فارم سے ہوکر وہ ریلوے اسٹیشن سے باہر آکر رکشہ تلاش کرنے لگا۔ اس کو لوکو گیٹ آنا تھا۔ پھر وہاں سے کالونی اپنے گھر، کالونی اس نے کرائے پر ایک ریلوے ملازم سے لے رکھی تھی، اس گھر میں اس کی ماں، بیوی، اور ایک گیارہ سال کا اس کا اپنا لڑکا رہتا تھا۔

وہ الہ آباد اپنی سسرال ایک شادی میں گیا تھا۔ سسرال شادی میں اس کی بیوی نہیں گئی تھی، اس کے پیٹ میں آٹھ ماہ کا ایک بچہ تھا اور ڈاکٹر نے اس کو چلنے پھرنے سے بھی منع کیا تھا۔ لڑکے کے امتحان چل رہے تھے، وہ شادی میں جانا تو نہیں چاہتا تھا مگر بیوی کا چہرا دیکھتے ہوئے جانے پر مجبور تھا۔

وہ ٹریڈ ٹیکس محکمہ میں کلرک تھا۔ ان دنوں اس کے پاس کام بہت تھا۔ اس محکمہ میں پیسہ اس قدر تھا کہ ہر سوال کا جواب بلا پیسے کے نہیں تھا۔ شادی میں دو دن برباد ہوئے اور خرچ الگ رہا۔ آفس کا نقصان ملا کر کل دس گیارہ ہزار کا ہوا تھا۔ خود اپنے اور گھر کے امن کے لئے وہ مجبور تھا سسرالی شادی میں جانے کو۔ شادی میں سالیوں نے بیوی کو نہ لانے پر زبردست کھینچائی کی اور ساس ماں نے تو یہاں تک کہہ دیا ٹیکسی کر کے ہی تم لوگ آجاتے، اللہ نے تو سب کچھ دے رکھا ہے، مگر طبیعت میں کنجوسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اشاروں میں ماں پر انہوں نے نشانہ لگایا جبکہ اس کی ماں بے حد سیدھی

اور شریف تھیں۔

جانے کیسے وہ ان سبھی کے وار جھیل گیا اس کو خود پر حیرت ہوئی مگر انکی باتوں سے اس کو دلی تکلیف ہوئی تھی۔ شادی سسرالی رشتے میں بیوی کی ماموں کی سسرال میں تھی، الہ آباد سے تیس کلومیٹر پورب کی جانب بس سے جانا تھا، پھر اس کے بعد تین کلومیٹر ٹیمپو سے تب جا کر کہیں خیر پور گاؤں آتا تھا۔ ٹمپو میں سواریاں بھوسے کی طرح بھری ہوئی تھیں، ہاتھ، پیر، جسم سے کچھ اس طرح رگڑ کھا رہے تھے کہ احساس کی چھاؤں میں کوئی بھی نقش ایسا نہیں تھا جو بیدار نہ ہوا ہو۔ آگ اور پانی سے جسم جل رہے تھے، مگر چہروں پر سپاٹ پن موجود تھا۔ ہاں، جذبات چھپانے کے لئے کوئی تو گاؤں اور کوئی اِدھر اُدھر دیش سرکار کی باتیں کر رہا تھا لیکن وہ خاموش تھا۔ اس کے بغل میں ایک چالیس سالہ دیہاتی عورت جو ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس، اس پر جھکی ہوئی تھی اور اس کا سارا بار وہ اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے جاگ رہا تھا اور ایک وقت تو اس کو ایسا لگا کہ وہ ابل پڑے گا اور جو بھی ہے وہ بکھر جائے گا اس کے ماتھے پر پسینہ آچکا تھا مگر وہ پونچھ بھی نہیں پا رہا تھا کیوں کہ اس قدر سٹاؤ تھا کہ ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ٹمپو اوبڑ کھابڑ راستے پر ہلتا ڈلتا دوڑ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ خیر پور پہونچ گیا۔ خاطر مدارات تو خوب ہوئی۔ سالیوں نے جہاں اس پر طنز کے نشتر چلائے وہیں ہنسی مذاق میں کوئی حد مقرر ہونے نہیں دی، اس نے بھی کچھ باقی نہ رکھا، گل بوٹے تک بنا دیئے تھے، ہنسی میں چیخ و پکار بھی کئی بار شامل رہی، اس کے دل و دماغ نے فرحت بھی محسوس کی، بیوی اس کی آٹھ ماہ کی حاملہ تھی، وہ اس لئے تناؤ میں بھی تھا۔ اس بات کو لے کر اس کی سالیوں نے کافی کچھ مرچ مسالے کا استعمال کیا۔ جس پر وہ مسکرایا بھی اور ساتھ رہنے کی گھر پر بیوی کی جگہ دعوت بھی دی جس پر کافی دیر بڑی ہائے توبہ مچی تھی مگر وہ بھی بڑا اولا تھا مذاق اور سالی کا رشتہ بنا کر بھاگ نکلا۔ اس درمیان اس کی ساس نے بھی اس کو دیکھ کر کئی بار کچی پکی، سخت سست باتیں کہیں جسے اس نے موقع کی نزاکت جان کر برداشت کیا۔

دوسرے دن جب وہ جانے لگا تو اس نے اپنی بڑی سالی کو الگ بلایا، اس پر سالی نے اس کو کڑوی نگاہ سے دیکھا۔ بات تو سنو دوبارا کہنے پر چوکنا ہوتے ہوئے آئی اور تیز آواز میں بولی، ''کیا بات ہے؟'' تو وہ سہم سا گیا مگر فوراً ہی پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ''ارے بھئی آپ ابھی تک ناراض ہیں، ہنسی مذاق میں برا مت ماننا۔ پہلے تو آپ نے ہی شروعات کی تھی۔

اس درجہ مذاق ہوگا، اس کی بڑی سالی نے اس کو گھورا، اس پر اس نے مکھن لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ارے بھئی اب معاف بھی کردو۔ تب اس نے پوچھا تھا۔ کیا بات ہے؟ وہ مکاری سے بولا تھا کہ بچہ ہونے میں ابھی ایک ماہ باقی ہے کسی کو بھیج دو یا تم ہی چلی آؤ۔

اچھا تو یہ بات ہے، اماں سے بات کروں گی، ان کو ہی بھیج دوں گی، اس کی سالی نے جواب دیا تھا۔ اس پر وہ ایک منٹ خاموش رہ کر پھر بولا کہ بہتر ہوگا اماں یا تم۔ اگر دونوں ہوں تو آپ کی بہن بہت خوش ہوگی اس کی بڑی سالی یہ سن کر بولی، اچھا تو تم شرارت کی پوری آزادی چاہتے ہو۔ وہ کان پکڑتے ہوئے بولا۔ نا بابا، نا قسم لے لو۔

پیدل چلتے ہوئے اس کے ذہن میں شادی میں ہوئی ایک ایک بات یاد آرہی تھی، اس میں مست وہ چلا آرہا تھا کہ ایک کرخت آواز اس کے خیالات کے ہجوم میں داخل ہوئی اے اتنی رات کو پیدل کہاں سے آرہا ہے؟ لگتا ہے تو سالا صبح کے لٹیرے گروہ کا آدمی ہے۔ یہ سن کر وہ اندر تک کانپ اٹھا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''نہیں صاحب میں لٹیرا نہیں ہوں ٹریڈ ٹیکس اسٹیٹ گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ کرخت آواز یہ سنکر بڑی زوردار ہنسی میں بولا۔'' سالا تم لٹیرا نہیں ہے ٹریڈ ٹیکس کا بابو ہے۔ کرخت آواز پھر گونجی۔ کیا ثبوت ہے تیرے پاس؟ تو وہ اپنا کارڈ دکھانے لگا۔ ہوں کی آواز، اب کہاں جا رہا ہے؟ لوکو گیٹ، شادی سے آرہا ہوں۔ ٹرین دیر سے الہ آباد سے کانپور پہونچی۔ رکشہ نہیں ملا اس لئے پیدل چل دیا۔ کرخت آواز پھر گونجی۔

ایس آئی کہاں ہے؟ جی سر، اس بابو کو لوکو گیٹ تک چھوڑ آؤ۔ نہیں صاحب،

میں پیدل چلا جاؤں گا۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ اچھا، اور پھر صبح رپورٹ درج کرانے آؤ گے کہ مجھے لوٹ لیا گیا ہے، لہجہ بے حد سرد تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا...... پولیس جیپ اس کو لوکو گیٹ پر اتار کر جا چکی تھی، اتارتے وقت ایس آئی نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا کیا ہے تیرے پاس؟؟ اس نے بتا دیا تھا کہ دو جوڑ پہنے ہوئے سوٹ ہیں، بریف کیس میں اور کچھ بھی نہیں ہے... ابے میں نقدی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ ایس آئی نے اس کو سر سے پیر تک گھورا تو اس نے اپنا پرس نکال کر دے دیا۔ بس، اتنا ہی ہے؟ ایس آئی کے ہاتھوں میں تین سو دس روپے تھے۔ خالی پرس اس کے ہاتھ میں تھما کر جیپ آگے بڑھا دی اور وہ جاتی ہوئی پولیس جیپ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایس آئی کے لئے ماں کی گالی گونجی، جسے تیز آواز میں بک کر وہ ریلوے کالونی کی جانب چل پڑا۔

فرق لوگوں کا

میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور سنگ تراش اپنی انگلیوں کا جادو پتھر میں سمو رہا تھا۔ سنگ تراش کے ہاتھوں میں چھینی اور ہتھوڑا تھا اور سامنے پتھر کا ایک بڑا سا ٹکڑا اور اس ٹکڑے میں دلوں کو سحر زدہ کرنے والا دلفریب خاکہ۔ اس کے ذہن میں موجود تھا۔ دھیرے دھیرے پتھر کی ہیئت تبدیل ہونے لگی۔

سنگ تراش پتھروں کو روز نئی نئی شکلیں اور شباہتیں اور نئے نئے پیکر عطا کرتا تھا، سنگ تراشی ہی اس کا ذریعہ معاش تھی۔ مجھے یہ سنگ تراش بہت پیارا لگتا تھا۔ اس کے کام کرنے کا انداز، اس کا انہماک، اس کی دلچسپی، اس کا کھویا کھویا وجود اور فن سے محبت ....اس کے ان سارے انداز میں عجیب والہانہ پن تھا اسے اپنے فن پر پورا عبور حاصل تھا۔

ایک دن میں کالج سے ذرا جلدی چل پڑا، اپنی سائیکل سے بس یوں ہی۔ بغیر کسی پروگرام کے، اچانک طبیعت اچاٹ ہوئی۔ کالج اور گھر کی آمدورفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس میں سنگ تراش کی دوکان بھی تھی اور وہی اس کا گھر بھی تھا۔ میں نے سنگ تراش کی دوکان کے سامنے اپنی سائیکل روک دی۔ سنگ تراش نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ جواباً میں بھی مسکرا دیا۔ آج جلدی چلے آئے؟ ہاں دل نہیں لگ رہا تھا اس لئے چلا آیا۔ کیوں؟ دل کیوں نہیں لگ رہا تھا؟ کوئی خاص وجہ نہیں بس..... اچھا اچھا بیٹھو۔ اور میں ایک مونڈھے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے معنی خیز نگاہوں سے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔

سنگ تراشی سے میری دل چسپی اور محبت دیکھ کروہ میری جانب متوجہ ہوا تھا۔ مجھے اس شہر میں آئے تقریباً سات ماہ ہونے کو آ رہے تھے۔ میرے بابا کا تبادلہ شری پور میں ہوا اور تب ہی سے میری سنگ تراش سے دوستی کا سلسلہ شروع ہوا تھا میں نے سنگ تراش سے کئی بار یہ سوال کیا کہ تمھیں سنگ تراشی سے لگاؤ کیسے ہوا؟ اور یہ فن تمھیں کس نے سکھایا لیکن اس نے کبھی بھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ بس ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا۔ سنگ تراش کے جواب نہ دینے سے میں ایک عجیب سی بے کلی سی محسوس کرتا کہ آخر میرے سوال میں ایسا کون سا راز چھپا ہوا ہے جو سنگ تراش بتانا نہیں چاہتا جبکہ عام طور پر ایسے سوالوں کا جواب فوراً دے دیتے ہیں کہ میرے استاد فلاں ہیں جو اپنے وقت کے بہترین سنگ تراش تھے جنھیں اپنے فن کے نشیب وفراز میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ کافی شہرت کے مالک تھے۔ ان کی عظیم شخصیت ہے مگر یہ عجیب شخص ہے۔ نہ جانے کون سی وجہ تھی؟ اس کی خاموشی میرے اندر اضطرابی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ حقیقت کو ایک دن ضرور جان لوں گا۔

وہ مجھے مونڈھے پر بٹھا کر پتھر کے نقوش ابھارنے میں مشغول ہو گیا۔ میں کافی دیر تک پتھر کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک من موہنی صورت میں بدل چکا تھا اور سنگ تراش بھی کافی تھک چکا تھا۔ میں نے سنگ تراش سے پوچھا۔ پانی دوں۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میں نے کٹورے میں پانی لا کر سنگ تراش کو دیا۔ ایک ہی سانس میں اس نے لبریز کٹورے کو خالی کر دیا اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔ بور تو نہیں ہوئے۔ بور ہونے کی کیا بات ہے۔ نہیں، اوہ، میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ سنگ تراشی بھی عجیب کام ہے ہر وقت اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا رہتا ہے۔ اپنے ماحول سے بے خبر۔ میں نے کہا۔ یہی ایک فنکار کی خوبی ہے کہ خود میں ڈوب کر اپنے فن سے دنیا کو روشناس کراتا ہے۔ تخیل کے کینوس پر جو خاکہ وہ بناتا ہے اسے اپنے فن میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

میری اس بات سے سنگ تراش بے حد خوش ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ سے

چائے بنا کر پلائی۔ بہت لذیذ چائے تھی۔ اس کا ذائقہ کچھ ایسا تھا کہ کافی دیر تک زبان پر چاشنی رہی۔ میں نے سنگ تراش کو موڈ میں دیکھا تو وہی اپنا سوال دہرایا تم کو سنگ تراشی کس نے سکھائی؟ سنگ تراش نے مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا کہ آخر تم کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ یہ میری زندگی کا ایک راز ہے۔ تم اسے جان کر کیا کرو گے؟ میں نے سنگ تراش کے چہرے کی رنگت سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ آج بتانے کے موڈ میں ہے۔ لوہا گرم ہے صرف چوٹ کرنے کی ضرورت ہے میں نے کہا۔ یہ تو میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا کہ کوئی راز ضرور ہے تبھی تو میرے بار بار پوچھنے پر صرف ہنس کر تم ٹال جاتے ہو میں اس راز کو جاننے کی خواہش رکھتا ہوں۔ میں سنگ تراش کے فن کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے فن میں ایسی قوت ہے جس کی جدا جدا شکلیں اپنے اندر الگ الگ داستان رکھتی ہیں۔ یعنی کہ وہ بہترین کہانیوں کا کہانی کار ہو جیسے۔

سنگ تراش نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں جیسے وہ گم شدہ کڑیوں کا ایک سرا دوسرے سرے سے ملانے کی کوشش میں مبتلا ہو۔ تھوڑی دیر میں سنگ تراش نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ چہرے کے تاثرات نے فکر و احساس کا احاطہ کر لیا تھا۔ آواز میں بلا کا سوز۔ میں سنگ تراش کی اس بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اتنا کرب و اضطراب جیسے صدیوں کا درد لمحوں میں بدل چکا ہو۔ نحیف آوازی میں سنگ تراش کہہ رہا تھا۔

ہمارے آبا و اجداد سے پتھر توڑنے اور اس پر شکلیں بنانے کا کام ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہمارے خاندان کی قدیم روایت ہے کہ ہم پتھر توڑنے کا ہی کام کریں گے چاہے ہم جہاں بھی ہوں۔ اس بات کا حلف ہمارے خاندان کا بزرگ دلاتا ہے۔ میں نے بھی اس روایت کے مطابق حلف لے کر چھینی اور ہتھوڑی پکڑ لی۔ میں نے تمہیں پہلی بار اس لئے نہیں بتایا تھا کہ یہ ہمارے خاندان کی قدیمی روایت ہے۔ میں پتھر سے ٹکرا کر اس کو نرم و نازک پیکر عطا کرتا ہوں۔ کیوں کہ سنگ تراشی میرے لہو میں رچی بسی ہے۔ میری روح تڑپا کرتی ہے جس دن میں سنگ تراشی نہیں کرتا! اگر میں تم کو پہلی دفعہ

اس کی حقیقت کو بتا دیتا تو تم اس کی اہمیت نہیں سمجھتے اور تمہارے دل و دماغ میں یہ بات آجاتی کہ یہ اُن کا آبائی پیشہ ہے۔ نہیں یہ ہمارا پیشہ نہیں بلکہ یہ میرے بزرگوں کی روایت ہے جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ایک بار میرے خاندان کے ایک فرد نے اس روایت سے بغاوت کی لیکن اسے اس بغاوت کی بہت بڑی سزا بھگتنا پڑی۔ خاندان کے افراد نے اسے پکڑ زنجیروں سے جکڑ کر قید کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخرش ایک دن اس نے دم توڑ دیا۔ بغیر کھانا پانی کے آخر وہ کب تک زندہ رہتا۔

سنگ تراش کا جواب سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ میرے ذہن میں ہیجان بپا ہونے لگا کہ اس ان پڑھ جاہل، غیر مہذب قبیلے کے سنگ تراش کو اپنی روایت کس قدر پیاری ہے اور ایک ہم لوگ ہیں جنھیں اپنی روایت کا پاس نہیں اور ہم اسے پامال کرتے رہتے ہیں اور اسے کامرانی سمجھتے ہیں۔ میرا سر ندامت سے جھک گیا

اور سنگ تراش کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کسی فاتح کی مسکراہٹ سے مشابہ تھی۔

☆☆

احساس

کبوتروں کا ایک جوڑا۔اپنی چونچوں میں ہری ہری زیتون کی شاخیں دبائے ہوئے آسمان کی وسیع تر پہنائیوں میں پرواز کررہا تھا۔ یہ منظراس نے ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔

مسرت کا وہ لمحہ اور بدلتے ہوئے رنگوں کا عکس دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہو اٹھا۔

یا اللہ.........یہ دنیاوی خدا، کیا طاقت کے نشے میں خود کو بھول بیٹھے ہیں۔ انسان کا انسان پر ظلم، بکھرے ہوئے جسم اور بہتا ہوا لہو......جغرافیائی حدود میں بٹے ہوئے ممالک اور اس میں رہنے بسنے والے کالے گورے انسان، بچپن.....بھوک...... ......کا احساس.....مگر سارے چہرے گڈ مڈ.........بے جان جسم بلکہ جسموں کا انبار... ....خود پرست عناصر انسانوں کو تقسیم کرنے میں منہمک.........

خدائی کا بھرم لئے ہوئے جدید ترین سامانوں سے لیس سمندر کا سینہ چیرتے، آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے ہوئے، زمین کو اپنے آہنی قدموں سے روندتے ہوئے موت کے سوداگر دکھائی دے رہے تھے۔خوف وہراس پھیلتا جارہا تھا.......

اب کیا ہوگا؟.............کیا ہوگا؟

وہ اپنی نگاہیں انٹرنیٹ پر جمائے ہوئے منظروں میں غرق مگر اس کا تجس اس کو بے چین کئے ہوئے، پھر آگے کیا ہے؟ آگے.....انگلیوں میں جادو بھرنے پر مجبور تھا۔

خاک اور خون میں نہائے ہوئے مظلوم انسان......بے گناہ انسان........کمزور ہونے کی سزا بھگت رہے تھے........

وہ بہت دور بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔نہ اس کے پاس آنسو تھے نہ خوشی.. ....بے حسی کا کرب لئے وہ منظروں کو دیکھ رہا تھا........کہیں گولی تو کہیں اینٹ... ..آگ برساتے، آبادیوں کو مسمار کرتے طاقتور انسان......انسانی رشتوں پر اوس کی بوندیں نہیں آگ کے شعلے پھر بھی ہر کوئی انسانیت کی دہائی دیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔نسلی بالا دستی......طاقتور ہونے کا گھمنڈ........نئے معنیٰ پہنا رہا تھا......سر کو تھامے ہوئے وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔

تاریخ خود کو دوہرائے گی فرعون کے لئے موسیٰ ......ہر فرعون کے لئے موسیٰ......اقتدار ،ارتقاء تہذیب کے دروازے غرق ہوجانے کو بے تاب ......انسانیت کی سربلندی کے لئے کچھ تو ہونا ہی چاہئے........

درمند ،انسانیت دوست چیخ رہے ہیں ،ہمیں جنگ و جدل نہیں ،امن چاہئے ......امن کا دشمن انسانیت کا دشمن ......ہمیں دشمنوں کی نہیں دوستوں کی ضرورت ہے۔لہو کی کھیتی کرنے والے نہیں ،مرہم اگانے والوں کی ضرورت ہے۔ محبت کا لافانی پیغام سننے کو ترس رہے ہیں کان......

دنیا کے انسانو!........کیا تم بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہو؟.......

دیوانہ

ہوائیں چلتی ہیں، منظروں کی دلکشی موجود رہتی ہے مگر ان لوگوں کو کیا کہا جائے جو دیوانے ہوتے ہیں؟

دیوانوں کی کوئی ذات نہیں ہوتی، برادری نہیں ہوتی، تبھی تو وہ اپنی دھن میں مست تھا۔

ایک ہاتھ میں اس کے قد سے بڑی لاٹھی، سر پر کالی ٹوپی، سفید شرٹ اور نیکر پہنے وہ روز پارک کے ایک کونے میں خود ساختہ جھنڈے کو سلامی دیتے ہوئے لاٹھی کے کرتب دکھایا کرتا...... دور کھڑے لوگ اس کی ان حرکتوں پر مسکراتے رہتے مگر وہ... ...... دیوانہ جو ٹھہرا......

ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے جب اس نے سڑک پر چلاتے ہوئے کہا تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد تو ایک ہیں، معاشرتی نظام کی گندگی سے پریشان ہو کر الگ ہو جانے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ یہ سب ہمارے اپنے نہیں ہیں۔

لوگ اس کی باتوں کو سن کر ہنس رہے تھے۔ طنز کر رہے تھے لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے سنجیدگی تھی۔ عزم تھا۔ دیگر لوگ اس کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے مگر اس کا وجود پتھر کی طرح موجود تھا۔

پریم کی گنگا وہ اپنے ہی لوگوں میں بہاتا اور دوسرے فرقہ کے خلاف ذہنوں میں عداوت اور نفرت کے بیج بوتا رہتا ہے۔ قدیم تہذیب کی دہائی دے کر آپسی وشواس

کی ڈور کو توڑ دینے میں وہ استاد مانا جاتا تھا۔ تہہ کیے ہوئے تھان کی طرح وہ خود کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

ایک دن وہ نیکر دھاری اپنی بستی میں بتا رہا تھا کہ ہم لاکھوں کی تعداد میں جا پہنچے ہیں ایک بہت بڑی فوج ہمارے پاس، لاکھوں نہیں کروڑوں ہاتھ ہیں۔ لاٹھیاں ہیں، اور نفرت سے بھرے ذہن ہیں جو آگ اور خون کے پیاسے ہیں، ہمیں انقلاب لانا ہے، ہم ٹھیکے دار ہیں ملک وقوم کے، ہمارے پاس، پیسہ لاتعداد، ہم قانون کو بدل دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ہم نے بابری مسجد گرا کر بدنما تاریخ مٹا دی ہے، مندر تو بن کر رہے گا۔

نیکر دھاری لاٹھی اٹھائے بولتا جا رہا تھا۔ جغرافیائی حدود میں چاہے چرچ ہو یا اسلام اور دیگر مذہب...... اس کو ہندوستانی روایتوں میں ڈھلنا ہوگا۔ نہیں تو ہم جینے کے تمام راستے بند کردیں گے۔ ہم تیار ہیں۔ ہم زیادہ دنوں تک بوجھ برداشت کرنے والے نہیں ہیں۔ رام اور کرشن کی اولادیں خود کو پہچان گئی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ تخلیق کائنات کے بعد آدم وحوا تشریف لائے اور انسانی نسل نے فروغ پایا۔ ساتھ ہی امن اور قتل کی باتیں وجود میں آئیں۔

دیوانے کی بڑ جاری رہی...... بڑی بڑی اخبار کی سرخیوں میں اس کا نام آنے لگا اعتدال پسند طبقے نے کہنا شروع کردیا کہ ملک اور قوم کے تم ہی ٹھیکے دار نہیں ہو۔ جب ملک غلام تھا تب تمہاری دیوانگی کہاں سو رہی تھی۔ اپنی جان ومال کو کون نچھاور کر رہے تھے؟ کون قیادت کر رہا تھا؟ کھلے ذہن کے لوگ کتنے تھے اور وہ بھی اپنی مفاد پرستی میں نفرت کی آگ روشن کر رہے تھے اور ایندھن بھی۔ ان سب سے الگ اپنی دھن کا پکا دیوانہ، ایک کمزور سا انسان۔ اپنی باتوں سے سب کو متحد کر رہا تھا۔ محبت کا راستا بنا رہا تھا۔ فکر واحساس کے دریچے کھول رہا تھا۔ ذات پات اور نفرت وعداوت کے دائرے ختم کر رہا تھا۔ ملک کو آزادی دلائی ایک وہ بھی دیوانہ تھا۔ لیکن اس کی دیوانگی میں محبت کا باؤلا پن تھا...... اور ایک یہ نیکر دھاری دیوانے، جو آگ اور خون کی بات کرتے

ہیں۔اتحاد کے بجائے نفاق کو ہوا دیتے ہیں۔

ہر دس کوس کے بعد جہاں زبان اور تہذیب ،رسم ورواج الگ وجود رکھتے ہیں، وہاں کون سی ایکتا ہم کو ملتی ہے جو ہمیں ایک رہنے کا سبق سکھائے۔یہی نہ کہ ہمارا خون ایک ہے، ہم انسان ہیں۔بھلے کاشت کار، مزدور، کلرک، مدرس، یہ حکمراں طبقے کے فرد ہوں۔ملی جلی تہذیب، بلاتفریق ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت، خوشی ہو یا غم۔ہم ایک ہیں، ایک ساتھ جیتے مرتے ہیں۔صدیوں نہیں ہزاروں سال کی تاریخ شاہد ہے مگر ہم ماضی پرست بھی نہیں ہیں۔حال اور مستقبل پر ہماری نگاہیں ہیں۔

سنو.....اور غور سے سنو......میں بھی ایک دیوانہ ہوں، مگر......

غلامی جس کی زنجیریں ہمارے بزرگوں نے اپنی قربانیاں دے کر کاٹی ہیں۔ کیا پھر پہنانا چاہتے ہو؟ دیوانہ خود سے باتیں کئے جارہا تھا....اور اس کی آواز لمحہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔

سچا جانشین

بے کراں سمندر مچل رہا تھا۔ اس کی موجیں دلوں میں اضطرابی کیفیت پیدا کر رہی تھیں اور ادھر مینا بے تاب تھی۔ اس کا جسم جل رہا تھا لیکن وہ نہیں آیا جس کا انتظار تھا۔ آخر وہ آتا ہی کیوں؟ اب تو اس کا مقصد حل ہو چکا تھا۔ اس کا احساس مینا کو بھی تھا۔

لیکن وہ آئے گا..... ضرور آئے گا...... یقین جو ٹھہرا......

ہر روز کی طرح اس روز بھی مینا شاپنگ کرنے کو نکلی۔ اپنی ضرورت کا سامان خریدنے کے لیے، اس نے اپنی ممی کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا جو اس کی نگاہ میں بہتر تھا اور منافع بخش بھی۔ وہ بڑا مول بھاؤ کر کے چیزوں کو خریدتی تھی۔

مینا مول بھاؤ کو ایک ہنر سمجھتی تھی اور اس کا استعمال بھی وہ بڑے خوبصورت انداز میں کرتی تھی۔ دوکان دار کبھی کبھی ہی نہیں بلکہ زیادہ تر اس کے جھانسے میں آجایا کرتے تھے مگر گھاگھ قسم کے دوکاندار اس کی دلفریب حرکتوں کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیتے تھے۔ وہ بڑے ہی خالص دوکاندارانہ انداز اور انہماک سے اپنا مال بیچ دیتے تھے...... ہاں... لطف اندوز ضرور ہوتے تھے۔

مینا کو ایک دوکان دار نے ایک لہنگا چنری بالکل نئے فیشن کی دکھائی اور اسے دیکھتے ہی مینا نے دل و جان سے پسند کر لیا لیکن اس کے دام اتنے زیادہ تھے کہ مینا کی قوت خرید سے باہر تھے اس لیے اس نے اس کو خریدنے کے لیے اپنے تمام حربے دوکان دار پر آزما ڈالے مگر اس نے قیمت میں کوئی کمی نہ کی...... یہ مینا کے لیے اہانت

آمیز بات تھی۔ ہارنا تو مینا نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ لہذا یہ کہتے ہوئے کہ پیسے کم ہیں.. کل آؤں گی اپنے گھر کی راہ لی۔

دوسرے دن مینا نے اپنی سب سے بہترین پوشاک زیب تن کی اور خود کو بنا سنگار کر ناز وادا کا پیکر بنکر پھر اسی دکان پر پہونچ گئی۔ جہاں اس کو لہنگا چنری پسند آئی تھی۔ اتفاق اس وقت دوکان دار موجود نہیں تھا اس کی جگہ ایک خوب رو نوجوان بیٹھا تھا۔ جس کے حرکات وسکنات سے دل پھینک جوانوں جیسا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے جب مینا جیسی حسین وشوخ اور فیشن پرست دوشیزہ کو دیکھا تو فوراً اس کی فرمائش پر لہنگا چنری دکھانے لگا اور خود مینا کے حسین خد وخال دیکھنے میں محو ہو گیا۔ مینا تو خریداری کی نیت سے آئی ہی تھی دونوں کی حریص نگاہیں ایک دوسرے پر لگی تھیں۔ ایک کو لہنگا چنری چاہئے تھی تو دوسرے کو خوبصورت جسم..... اس لیے دونوں ہی اپنی ضرورت کے تحت ایک دوسرے پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس کی بیباک نگاہوں کے طلسم میں مینا خود کو ہار بیٹھی۔ وہ تھا ہی کچھ ایسی شخصیت کا مالک کہ وہ اس کے من میں اترتا چلا گیا۔

مینا نے باتوں ہی باتوں میں اس کی اتنی تعریف کر دی تھی کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ ایک دوکان دار ہے۔ کتنی پیاس تھی اس کی نگاہوں میں۔

مینا کے ذہن میں پل پل ایک طوفان سا مچلنے لگا، وہ ہر لمحہ بیقرار رہنے لگی اور پھر وہ پسند امپوریم میں ہر روز جانے لگی کسی نہ کسی چیز کی خریداری کا بہانہ لے کر کیونکہ اس کی روح کی طمانیت کا سامان وہیں موجود تھا۔

اس کا باپ کئی دن سے نظر نہیں آرہا تھا جب وہ موجود ہوتا تو مینا وہاں جاتے ہوئے شرمایا کرتی کیونکہ اس کا باپ بہت ہی تیز نگاہوں سے اسے گھورنے لگتا تھا اور مینا کو اس کی آنکھیں بدن کے ہر نشیب پر رینگتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ تب اس کی ساری شوخی ختم ہو جاتی۔ وہ شرم وحیا کے ملے جلے تاثرات لیکر فوراً دوکان سے باہر نکل جاتی۔ موڑ کے آخیر کنارے پر پہنچ کر جب مینا پلٹ کر دیکھتی تو اس کا من پسند اپنی پیاسی آنکھیں کھولے ہوئے اس کو تاکتا رہتا اور تب مینا اپنے بالوں کو ایک ہیجان خیز انداز دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتی تھی۔

''پرانے لوگوں نے کہہ رکھا ہے کہ دل سے دل کو راحت ہوتی ہے'' دونوں جانب دلوں میں جوان جسموں کی آگ موجود تھی، اس تپش میں دونوں جل رہے تھے اور ان کی پیاس میں شدت کے عنصر شامل ہو چکے تھے۔

پیس گارڈن کے وسیع وعریض، ہرے بھرے پیڑوں اور پھولوں کے درمیان مینا کا اس سے ملن ہوا تو جذباتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر طرز وادا سے جوانی کی اُمنگ ظاہر ہو رہی تھی صدیوں پرانے لفظ ''پیاس کی آگ'' میں وہ لوگ جلنے کے لیے مچل رہے تھے۔ وقت اپنے اندر کیف وسرور کے پُراسرار راز لیے بیتا جا رہا تھا اس کا کسی کو قطعی احساس نہیں تھا بھلا ان رنگین لمحات کی قید سے کون آزاد ہونے کی خواہش کرے گا۔

مینا نے لہنگا چنری کچھ اس انداز ونفاست سے پہن رکھی تھی اس کا حسین اور خوبصورت وجود اور بھی جان لیوا ہو چکا تھا پھر بھلا کچی عمر کی پیاس اور کیوں نہ بھڑکتی؟ وہ اپنا سارا جوش وخروش مینا کی گود میں سر رکھ کر سو چکا تھا۔ مینا کی مخروطی انگلیوں نے ایسا لمس بالوں میں پیوست کر رکھا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کے لیے تیار تھے۔ مینا تھی ہی سلگتا ہوا پیکر.......

اس نے اپنی چاہت کو یہ احساس دلایا کہ دیکھو کتنا خوبصورت میرا من پسند لباس ہے، ہماری تمہاری قربت کا یہی ایک متحرک پہلو ہے، جب تم مجھے پسند آئے اور تمہاری معصوم چور آنکھوں نے میری تمنا کی۔

مینا اور وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، سیر وتفریح کرتے ہوئے اپنے مچلتے ہوئے جذبات کی آندھی میں گم تھے۔ دلوں میں امنگوں اور ولولوں کا ایک نہ مٹنے والا سلسلہ تھا اور وہ خود سے بیگانا ہو کر ایک نئی ڈگر کے راہی بن کر اپنا سفر طے کر رہے تھے، بہاریں ہی بہاریں ان کے درمیان تھیں۔ خزاں کے نام پر ان کے قہقہے اور تیز ہو کر فضا میں دیر تک گونجتے رہے، جیسے نہ معلوم صدیوں کی تڑپ اور اب کبھی جدا نہ ہونے کا ان کو پوری طرح احساس اور یقین تھا۔

جب وہ تاخیر سے دوکان پہونچتا تو اس کا باپ پہلے تو مسکراتا اور پھر ڈانٹتا اتنی دیر کہاں لگا دی تھی.......بس کہیں نہیں.......لیکن یہ روز روز کی دیری اچھی نہیں ہے.. ....آئندہ نہیں ہوگی.....لیکن پھر وہی بے ڈھنگی چال......آخر کب تک یوں ہی چلتا رہے گا؟.........کوئی جواب نہیں.....وہ سر جھکائے ہوئے دکان میں بیٹھ جاتا۔احساس ندامت سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔

ایک دن گھر پر اس کا باپ، اس کی ماں کو بتا رہا تھا کہ تیرے لال کے آج کل یہ جلوے ہیں.....سنو جب تم جوان تھے تب تم بھی اس طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ تمہارے بارے میں تو شادی کے پہلے ہی میں نے اتنے قصے سن رکھے تھے جتنے میں نے سوچے بھی نہیں تھے۔

دیکھوجی وہ تو میری جوانی کی باتیں ہیں۔ میں تو بہت ہی دل پھینک تھا ہر وہ چیز جو دل کو پسند آجائے میں اس کو حاصل کر ہی لیتا تھا۔ کیا تم اس کا بین ثبوت نہیں ہو؟

لیکن قسم لے لو کہ تمہارے بعد جو کسی کو آج تک ایسی نگاہوں سے دیکھا بھی ہو...

کیا واقعی سچ ہے؟........قسم لے لو......

وہ بھی چھپ کر اپنے ماں باپ کی باتوں کو سن رہا تھا اور اس کا من چاہ رہا تھا کہ وہ خوب دل کھول کر ہنسے اور اپنی پیاری بینا کو یہ دل لبھانے والی کہانی سنائے جس کی نشانی کے روپ میں اس کا وجود آیا تھا۔

☆☆

محبت

موجودہ حالات کافی خراب ہوتے جارہے ہیں، ہمیں اپنے لیے، اپنی قوم کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔نہیں تو ہم بھی بے موت مارے جائیں گے۔

وہ ایک بھیڑ میں تقریر کررہا تھا۔اور جذبات میں شعلے بھرنے کی کوشش کررہا تھا۔جذباتی قوم ابل رہی تھی، نعروں کے درمیاں دوکانیں، مکانات جلائے جانے لگے، آگ اور خون کا کھیل جاری ہو چکا تھا۔

انسان انسان کی پرچھائیوں سے ڈر رہا تھا۔لوٹ، مار دھاڑ کا جانو موسم آچکا ہو۔گولیوں اور دھماکوں کی آوازوں نے کانوں کو بہرہ کررکھا تھا۔

چیخ و پکار کے معنیٰ مطلب بدل چکے تھے، مردہ خوروں نے جسم و جاں کو بے بھاؤ بیچنا شروع کر دیا تھا۔عزت اور شہرت میں لفظوں کا فرق باقی نہیں رہا۔لاشیں....جلی ہوئی لاشیں.....کٹی پھٹی لاشیں عورتیں، بچوں اور جواں مردوں کی بے کفن لاشیں....تباہ و برباد صنعتیں...آگ اور دھواں، چاروں طرف....

کتنا وقت لگا تھا بنانے...سنوارنے میں۔اربوں کھربوں روپیہ اور محنتیں صرف ہوئی تھیں۔ایک ماحول بنا تھا۔کاندھے سے کاندھے کا...تب ترقی کا سنہرا سورج اُگا تھا مگر اس وقت ہو کا عالم طاری تھا۔

یہ تصویر ہماری ہے، نہیں، ہماری ہو نہیں سکتی، ایثار و قربانی کی قدیم ترین روایتوں کے ہم تو مالک ہیں۔اس پر ہم فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔امن و بھائی چارگی پر یقین رکھتے ہیں۔دشمنوں کو بھی گلے لگا کر پیار کا اظہار کرتے ہیں، پریم کی گنگا بہاتے

ہیں، کھیتوں میں جو بھی اناج پیدا کرتے ہیں، اس پر حق کی طرح بانٹ دیتے ہیں غربا، مساکین کو...نگاہ ہی نہیں مدد کرتے ہیں۔ کبیر و چشتی و نانک کا پیغام ہماری اپنی زندگیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دریاؤں، پیڑ پودوں، پہاڑیوں اور لہلہاتے میدانوں کو خود سے جوڑ کر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں، شمس و قمر کی روشنیوں کو اپنی ترقی اور کامرانی کی نشانیاں مانتے ہیں، قوت و عزم کی بہاروں کو محور مان کر شادمانی کا اظہار کرتے ہیں اور روحانی خزانوں کا مرکز مانتے ہیں اور یہی نہیں سرحدوں کی حفاظتوں میں اپنی بیش قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

پھر ان خون آلود مناظر کا پیش آنا ہماری اپنی قدیم ترین ریت رواجوں کا ٹوٹنا بکھرنا بتاتا ہے۔ حقیقت سے انحراف کیا بھی نہیں جا سکتا اور اگر کیا بھی جائے تو کب تک....!

موجودہ نشانیاں ظاہر کر رہی ہیں کہ ہمارے دلوں میں زنگ لگ رہا ہے، نفرت کا زنگ۔ فرقہ پرستی اور جنونیت کا کھیل اور کھیل کا میدان ہے انسانی جذبات و احساسات ......ہم زمانہ ساز ہیں ہماری مانو...نہیں تو، یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا۔ نیم فوجی دستے ہیں ہمارے پاس.....گھبرانا مت، ہماری حفاظت میں تمھارا مستقبل تابناک ہوگا۔ ہم تقدیروں کو بدل ڈالنے کی قوت رکھتے ہیں، پلان ہے... ہاتھ میں اور لاتعداد پیسہ بھی۔

لیکن دھرتی جہاں ہم پیدا ہوئے ہیں وہ اپنے بچوں سے امن مانگ رہی ہے، زہریلی تباہ کن باتیں نہیں....وہ تو چاہتی ہے کہ ہمارے بچے..چاہے وہ پاجامہ، دھوتی کرتا، کوٹ پینٹ یا پھر نیکر، کوئی بھی شکل زیب کرتے ہوں، ہمارے اپنے ہیں۔ میری ہی کوکھ کا دودھ، پانی اور اناج استعمال کرتے ہیں، میری نگاہ میں سب برابر ہیں۔ خون کسی کا بہے، مجھے تکلیف ہوتی ہے، مکانوں میں رہتی ہوں، دھوپ، ہوا پانی میں میری تاثیر شامل ہے۔ بھلا میں اپنے بچوں کو پریشان کیوں دیکھوں؟ ہاں جب کوئی بے درد، سر پھرا میری روح کو ایذا دیتے ہوئے، میرے اپنوں پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑتا ہے تو میں اداس ہو جاتی ہوں اور مارے شدت کے رونے لگتی ہوں۔

دھرتی کی آواز، بے زبان آواز، کون سن رہا ہے؟ محسوس کر رہا ہے... مگر سننے والے سن رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں تبھی تو وہ چاہتے ہیں کہ امن کی فضا رہے، انسانوں کے درمیان قتل، غارتگری، غلامی کی نشانیاں ہیں، ترقی میں ہر ہاتھ کا کام ہے۔ جذباتیت، جنونیت کے بادل ہمارے درمیاں نہیں برسیں، برسنا ہی ہو تو ان کے یہاں، ان سروں پر برسیں جو نفرت کے بیج پیدا کرتے رہے ہیں۔

ہم ایسا ماحول چاہتے ہیں جہاں جینے اور پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع ہوں، رام اور رحیم، کبیر اور نانک کے بول دلوں میں پیوست ہوں، علاقائی زبانیں، رنگ و شکل، اونچ نیچ کے بول، اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے ہیں۔ خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، چاہے دن میں دیکھیں یا رات میں مگر خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ہم سبھی کو بہت کچھ کرنا ہوگا........ یہ لٹے پٹے انسان، مظلوم و بے سہارا انسان...... ہماری جانب امید و حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ قصور کیا ہے؟ میری حالت پر ترس کھاؤ... میری مدد کرو۔

ہم دھرتی کے رہنے والے بسنے والے ہیں۔
ہمیں محبت چاہئے......... محبت..........

☆☆

پھر وہی بات

بھاڑ میں جاؤ.....

یہ کہہ کر رئیس پاؤں پٹکتا ہوا چلا گیا۔

مگر نازنین پھر بھی بکے جا رہی تھی

....

راجو کو لیکر رئیس اور نازنین میں روز کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا تھا۔

راجو ایک بھولا بھالا لڑکا تھا جس کی عمر تقریباً ۱۱ سال کی رہی ہوگی۔ ایک فریبی کے بہکاوے میں آ کر اپنے گھر سے بھاگ آیا۔ پیت پور سے کانپور، کئی دنوں کا بھوکا پیاسا، ریلوے پلیٹ فارم پر رئیس کو ملا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کے ہاتھ پاؤں پر جلے کے نشانات موجود تھے۔ لوگ افسوس تو کرتے اس کو دیکھ کر۔ ساتھ ہی تبصرے کرتے ہوئے آ جا رہے تھے۔

لوگوں کی اپنی اپنی سوچیں۔ مگر رئیس نے راجو کے چہرے پر کچھ اور ہی محسوس کیا۔ اس کو اپنے گھر اُٹھا لایا۔ دوا کی، اس کو ہر طرح کا آرام اور سکون دینے کی کوشش کی۔ نازنین، رئیس کو ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ اس طرح ناز برداری کرتے دیکھ کر من ہی من جل بھن رہی تھی۔ اپنوں سے تو کوئی ہمدردی نہیں، پرائے سے اسقدر محبت ....لگتا ہے خون سفید ہو گیا ہے.....نازنین کی جو سمجھ میں آتا......وہ بکا کرتی مگر رئیس پر اس کے بکنے جھکنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

ہاں کبھی کبھار غصہ آ جاتا تھا تو وہ گھر کے باہر چلا جاتا تھا...........

اب راجو ٹھیک ہو چلا تھا اور گھر کا چھوٹا موٹا کام کرنے لگا تھا۔ رئیس، راجو کو ہر بات سمجھاتا کہ کیسے بات کرنی چاہئے اور کس طرح اپنے بڑوں سے پیش آنا چاہئے مگر نازنین کو راجو ایک آنکھ بھی بھاتا نہیں تھا۔

نازنین راجو کو مختلف انداز میں تنگ کیا کرتی تھی۔ طرح طرح کی باتیں کرتی، سوال اور جواب کرتی، ذہنی طور پر راجو کو ورغلاتی اور لالچ دیتی رہتی۔ راجو اپنے گھر پر پہلے بھی سیدھا کہلاتا اور اب بدھو......

ایک دن نازنین نے راجو کو بہت تنگ کیا تو راجو رئیس کو سامنے دیکھ کر رونے لگا.... کیوں روتا ہے راجو؟.... اتنا پوچھنے پر راجو اور زوروں سے رونے لگا۔ یہ دیکھ کر رئیس نے نازین کو ڈانٹ پلائی کہ تو اس کو ضرور پریشان کرتی ہوگی تبھی یہ رو رہا ہے.... کیا بات ہے؟... تو اس کو کیوں پریشان کرتی ہے؟

یہ سنکر نازنین پھٹ پڑی۔ مانو کوئی چٹان ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہو۔ اب تو رئیس بھی پریشان ہو اُٹھا۔

آخر بتاتی کیوں نہیں ہے؟... کیا بات ہے؟

اپنے لاڈلے سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے ہو؟ بہت پیار کرتے ہو... یہ سن کر رئیس کا ذہن اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا اور اس نے ڈپٹ کر راجو سے پوچھا کیا ڈرامہ ہے بے؟... راجو سہم گیا.. لرزنے لگا اور مارے ڈر کے بے ہوش ہو گیا.. رئیس کا دل پسیج گیا اور وہ راجو.. راجو پکارنے لگا۔ یہ دیکھ کر نازنین بھی گھبرا اٹھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سوالوں کا ایک ہجوم تھا دونوں کے درمیاں....

مگر راجو کی بے ہوشی نے ان کے ہونٹوں کو کچھ دیر کے لئے جیسے سل دیا ہو۔ رئیس نے پانی کی چھینٹیں ڈالیں اور اپنے ہاتھوں سے راجو کا چہرا پوچھنے لگا۔ اس درمیان اس کے منہ سے راجو.. راجو نکل رہا تھا لمس کو زبان ملی اور راجو نے آنکھیں کھول دیں۔

رئیس کو دیکھ کر راجو پھر رونے لگا۔ کیا بات ہے؟

کچھ نہیں... تو پھر رو کیوں رہا ہے؟

آپا مجھ کو بہت پریشان کرتی ہیں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں... رئیس نے نازنین کو گھورا... تو نازنین بڑبڑانے لگی، اپنی عادت کے مطابق... یہ دیکھ کر رئیس کو غصہ آ گیا۔

اور وہ نازنین کو پیٹنے لگا۔ ایک کہرام مچ گیا تھا گھر میں۔

قرب جوار کے لوگ معاملہ جاننے کو بے چین ہو رہے تھے۔ رئیس ایک مشہور آدمی تھا۔ دولت مند تھا۔ مگر کچھ کمیاں بھی تھیں۔

رئیس نے نازنیں کو پہلی دفعہ اس قدر بے دردی سے پیٹا تھا۔ سارا بدن لہولہان ہوا اُٹھا تھا۔ چوڑیاں ہاتھوں میں ٹوٹ کر دھنس گئی تھیں۔ ڈاکٹر آئے، دوائیں دی گئیں مگر فائدہ نہیں ہوا۔ ایک عجیب وغریب کیفیت بنتی جا رہی تھی۔ آخر کار نرسنگ ہوم میں بھرتی کرایا گیا۔ پوری باڈی کا چیک اپ ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا فوراً آپریشن کرنا ہوگا کیونکہ آنتیں پھٹ گئی ہیں۔

آپریشن کی تیاری ہونے لگی۔ رئیس سے کہا گیا تم کو ایک بوتل خون دینا ہوگا۔ رئیس کا بلڈ گروپ الگ تھا۔ نازنین کا الگ۔ ڈاکٹر نے یہ بھی سختی سے کہا کہ بازار والا بلڈ ہم نہیں استعمال کریں گے۔ اس سے مریض کی جان کو خطرہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر ماحول میں مایوسی چھانے لگی۔ رئیس اور نازنین، یہی کل کائنات تھی۔ رشتے ناتے دار تو بہت تھے۔ مگر سب دور، دور۔ رئیس اپنے کیے پر پشیماں ہو رہا تھا۔ مسکراتی نازنین، کھلکھلاتی نازنین، ہر دکھ میں سایہ بنی نازنین، حوصلہ دیتی نازنین۔ اس کے خیالات میں نازنین ہی نازنین رقص کر رہی تھی۔ رئیس پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا وجود رو رہا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ کچھ بھی کر سکنے کی سکت اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی اور ڈاکٹر کہہ رہے تھے مسٹر رئیس اگر خون نہیں ملا تو ہم کچھ بھی نہیں دے پائیں گے سوائے موت کے........

نرسنگ ہوم کے ماحول میں دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھ رہا تھا اور راجو ایک جانب

چپ چاپ نادم سا کھڑا تھا۔ آنسوؤں سے تر چہرا، اس کے دل و دماغ میں طوفان مچل رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہونے کی وجہ تو میں ہی ہوں۔

ڈاکٹر بار بار کہہ رہا تھا مسٹر رئیس خون چاہئے خون.... تلاش کرو تلاش، راجو بار بار کچھ بولنے کی کوشش کرتا مگر زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا اور بے چینیاں ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ راجو حالات کو محسوس کر رہا تھا۔ دفعتاً وہ قدم بڑھاتا ہوا ڈاکٹر کے پاس جا پہونچا، رئیس ڈاکٹر سے گڑگڑا رہا تھا، میری نازنین کو بچا لیجئے، کچھ بھی کیجئے اور ڈاکٹر رئیس سے کہہ رہا تھا صبر کرو اگر اس کی زندگی ہوگی تو کوئی نہ کوئی وسیلہ فراہم ہو ہی جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب ..راجو کی آواز کانپ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے نگاہیں اُٹھائی میرا خون............

کرشمہ ہو اُٹھا۔ راجو کا بلڈ گروپ، نازنین کا ہی بلڈ گروپ نکلا۔ ماحول بدل چکا تھا۔

چہروں پر سکون نمایاں ہو اُٹھا۔ تشکر بھری نگاہیں راجو پر مرکوز تھیں اور راجو آنکھیں بند کیے رئیس کا مسکراتا ہوا چہرا دیکھ رہا تھا۔ آپریشن کامیاب رہا...بھرپور کامیاب.....

نازنین صحت مند ہوگئی تھی مگر راجو سے شدید ترین نفرت تھی اس کو۔ رئیس نے ایک دن بڑی محبت سے نازنین کو بتایا کہ میں تو ہمت ہار چکا تھا کیوں کہ تمہارے بلڈ گروپ کا بلڈ ہی نہیں مل رہا تھا مگر...مگر کیا..؟..وہ تو اپنا راجو فرشتہ بن کر آ گیا تھا نہیں تو اللہ جانے کیا ہوتا۔ نازنین کو یہ سن کر چکر سا آ گیا تھا کہ جسکو میں نے ہر پل ستایا۔ اس نے ہی میری جان بچالی.... یا اللہ.....

پھر رئیس نے راجو کی دکھ بھری کہانی نازنین کو سنائی۔ میں نے راجو کی تیمارداری اس لیے کی تھی کہ وہ اس کا مستحق تھا۔ راجو کو بہلا پھسلا کر اور سنہرے خواب دکھا کر ایک پکی عمر والا اُڑا لایا۔ راجو کے ماں باپ مر چکے تھے بھائی اور بھابھی کچھ خیال نہ کر کے

اپنی ہی دنیا میں مست تھے۔ معصوم راجو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حساس تھا۔ ایک بہتر زندگی جینے کی تمنا نے اس کو گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ پکی عمر کا آدمی بہت گندا نکلا۔ اس نے راجو کے ساتھ غیر فطری حرکت کرنی چاہی تو راجو نے انکار کیا۔ اس وحشی نے راجو کو مجبور کرنے کے لیے اس کے جسم کو سلگتی سگرٹوں سے جگہ جگہ داغا اس کا سارا روپیہ پیسہ لیکر فرار ہو گیا اور بھٹکنے کے لیے راجو کو ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ گیا۔ راجو بے چارا اپنی بے بسی پر سسکتا ہوا اپنے وجود کو کوس رہا تھا کہ میں اس کو یہاں اُٹھا لایا۔

اب نازنین راجو کا خیال اپنے چھوٹے بھائی کی طرح رکھتی تھی اور یہ منظر دیکھ کر رئیس مسرور ہو اُٹھتا تھا۔

☆☆

ٹوٹے ہوئے جذبے

گداز بانہوں کا لمس اس کو آج تک یاد ہے۔

بیتے ہوئے شب و روز، اس کا اپنا احساس، اس کو کہاں سے کہاں تک لے آیا۔ درمیان کا لمبا سفر اس کو ایسا لگتا کہ جیسے کوئی اس کے اندر کا سب کچھ چرا لے گیا ہو۔ اس کے خواب، اس کے ہنر، اس کی اپنی جوانی، اس کا اپنا مزاج، سوچنے سمجھنے کا انداز، زندگی میں کچھ کر جانے کی امنگ۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن حالات کی لہروں میں سب کچھ بہہ جائے گا۔

سرد موسم کی دھوپ میں اس سے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرنا اس کی ماں کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ سست، کاہل اور باتونی کہتیں۔ صرف لفاظی کرنا اور کچھ عمل نہ کرنا ان کی نگاہ میں قطعی اچھی بات نہیں تھی کہ ابھی سے جب یہ حال ہے تو آگے کیا ہوگا مگر والد کا بے جا لاڈ و پیار شمس القمر کو ہر بار بچا لیتا تھا۔ بڑھاپے کی لاٹھی کا تصور ان پر غالب تھا اکلوتا بیٹا جو ٹھہرا۔

رفتہ رفتہ اس کے اندر لطیف جذبوں کا احساس پروان چڑھتا رہا مگر ذمہ داریاں بھی دھیرے دھیرے اپنا گھر بسا رہی تھیں کیوں کہ والدین اب بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

بیروزگاری کا احساس اور ساتھ ہی جوانی کا نشہ، ملن کی چاہ، معصوم جذبوں میں سرد جذبات، حقیقت کا بے رحم لباس، خیالات میں ہیجانی کیفیت، دن گذرتا نہ رات کٹتی، عجیب حالت تھی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سارے راز و نیاز کو پل بھر میں

عیاں کر دیتے۔ والد مزاجاً خاموش طبع انسان تھے۔ اس کے برعکس والدہ کے مزاج میں برہمی تھی۔ پال پوس کر بڑا جو کیا تھا۔ کیا انھیں کچھ کہنے سننے کا بھی حق نہیں ہے۔ وہ اس کی بے راہ روی پر نگاہ رکھتیں۔ سرزنش کرتیں۔

شمس القمر اپنے دوستوں میں بالکل منفرد مزاج کا تھا۔ بول چال عادت اطوار میں قطعی مختلف۔ دوسرے لفظوں میں وہ انتہائی ملنسار، لوگوں کے دکھ درد بانٹنے والا لیکن اس کے کرب کو کوئی سمجھنے والا نہیں تھا۔

ہر انسان کی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی تو گوشت پوست کا انسان تھا اس کی ضروریات فطری بات تھی۔ زبان سے کچھ نہ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بولنا نہیں جانتا تھا۔ اُسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ کچھ بولا تو قیامت آجائے گی۔ گھر کا ماحول جنگ کے ماحول میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنے گھر کی صورت حال کا اُسے بخوبی اندازہ تھا۔

درد وغم کی سیاہ رات کاٹنی کس قدر مشکل تھی۔ کیا اس سے نجات پانا ممکن ہے۔ اس کا ذہن اسی فکر میں ڈوبا رہتا۔ سوچ کے ان دائروں سے جتنا وہ نکلنے کی سعی کرتا اتنا ہی اس میں اُلجھتا جاتا۔ کیا ان دائروں سے نکلنا اس کی قسمت میں نہیں ہے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہاں وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا اور یہ وقت آخر کب آئے گا؟

شمس القمر کی دنیا دھیرے دھیرے اجڑ رہی تھی۔ کیا وہ والد کے بڑھاپے کی لاٹھی بن سکے گا؟ اس کا اعتماد لڑکھڑانے لگا تھا۔ فاصلے بڑھ رہے تھے کیونکہ نوکری مل نہیں رہی تھی۔ جو تھوڑی بہت پونجی تھی۔ اس کو کاروبار میں لگا دیا مگر جب خسارہ مقدر میں ہو تو کوئی کیا کرے۔ مفاد پرستی کے اس دور میں سیدھے سچے انسان کی کیا قدر... اور وہ لٹتا رہا... بکھرتا رہا... دوسروں کے غموں کو گلے سے لگا کر خود پریشانیاں جھیلتا رہا۔ غیروں کے دکھوں کو اپنا کر خود کو تباہ کرتا رہا۔ وقت کی تپش سے اس کے نقش و نگار تک جھلس رہے تھے۔

اس کی باتوں میں اب نہ وہ پہلے جیسی شگفتگی تھی اور نہ ہی انسانی جذبات و

محسوسات سے لبریز دل و دماغ... دیکھنے والے کہتے کہ یہ شمس القمر تو خالص دنیاوی انسان بنتا جا رہا ہے ... آخر اس کو کیا ہو گیا ہے؟

وہ اپنے والدین کے سارے دکھ سکھ میں برابر کا شریک ہوتا۔ ان کا پورا پورا خیال رکھتا۔ وہ اُن کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ فرمانبرداری کا زیور پہن کر وہ کامیابی کے راستے پر گامزن تھا۔

مگر جب کبھی وہ گداز بانہیں شمس القمر کو یاد آجاتیں تو گویا قیامت کی گھڑی آجاتی ہو اور کامیابی کا طلسم ٹوٹتا محسوس ہوتا، اس نے اپنے والدین کی اطاعت کو شعار بنا کر اپنی محبت کو قربان کر دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی سے محبت کے لطیف جذبات نکال دیئے تھے۔

اُسے وہ جملہ رہ رہ کر بار بار یاد آتا کہ ''تم مجھے بھلا کر کامیاب ہو گئے'' وہ اُسے بھلا نہ سکا تھا لیکن اُسے اپنی زندگی سے ہٹا کر ایک نئی زندگی کا آغاز ضرور کیا تھا۔ جس نے اس کی روح میں ہمیشہ کے لیے ایک اضطراب، ایک خلش بھر دی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ کیا وہ واقعی کامیاب ہوا ہے؟ کیا ٹوٹے ہوئے جذبوں کو کامیابی کا نام دیا جا سکتا ہے.....؟

کنڈوم

پیار کا میٹھا احساس
آج رات، ہم دونوں
جسم و جاں کی طرح

مانگ جسموں کی، عمر کی قید و بند سے آزاد ہو رہی ہے شاید کچھ ایسا ہی ہمارے اپنوں کا ماننا اور سمجھنا ہے۔ گھر کی ذمہ داریاں، ذہنی تناؤ، معاشی تنگی اور بڑھتے ہوئے فیشن کے چلن نے ہم سبھی کو خوبصورت نظر آنے کی دوڑ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

تمنائیں، خواہشیں کچھ اس قدر جوان ہو اُٹھیں ہیں کہ سارے حجابات اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں۔ ہوائیں اپنی تاثیر لیے ہوئے ذہنوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ معاشی فراوانی میں پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے دائروں میں بانٹ دیا ہے انسانوں اور زمینوں کو، خلاؤں میں بھی جوڑ توڑ جاری ہے، کھلا آسماں ہمارے اپنے جذبات کو بہت کچھ دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے۔

آخر سمندر، برف پوش پہاڑ کی جانب ہمارا دیکھنے کا مقصد کیا ہے؟ زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے، زمین پانی میں جگہ جگہ ڈوب کر ختم ہو رہی ہے، اور وسائل بڑھ رہے ہیں، پیداوار بڑھ رہی ہے، انسان بڑھ رہے ہیں، آبادی بڑھ رہی ہے۔ ایک جانب معدنیات کو کچھ کم خرچ کرو، زیادہ دن استعمال کرنا ہے۔ دوسری جانب جس نے پیدا کیا ہے وہی ضروریات بھی پوری کرے گا۔ تیسرے کہ ہم ترقی کر کے سب

کنٹرول کرلیں گے، ہمیں گودڑنہیں اعلیٰ دماغ کی نسل چاہئے۔

نئے نئے تجربات، ایجادات نے ہم میں نشہ بھر دیا ہے۔ہم قدرت کے طریقوں میں سیندھ لگانے کی کوشش میں منہمک دیکھے جاسکتے ہیں، نئے نئے مسائل، مشکلیں، ہمارے پاس ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے ہم دوائیاں سرجری اور مصنوعی اوزار کے بابت اشتہارات، قانون، ناٹک، اخبارات، چینلس اور جدید ترین طریقوں کو عمل میں لارہے ہیں مگر کمبخت آبادی ہے کہ گھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ ہم مجبور ہوکر اس جانب دوڑ رہے ہیں جہاں انسانی سوچ دیر میں پہنچ رہی ہے، انعام جھنڈا ہمارا ہی لہرائے۔ایک ذہنی جنگ جو گونج رہی ہے۔جغرافیائی رنگ ونسل وزبان کی حدود کو پار کرتے ہوئے، بڑی بڑی عمرانیات کی توپیں حیرت زدہ ہیں کہ یہ تغیر ہے یا انسانی آگاہی؟

جسم کی بھوک کا اپنا ایک علاحدہ مقام ہوتا ہے، مستی نے بنایا ہمیں مرضی کا مالک، گھر کا نظام درہم برہم ہونے کو آرہا ہے۔نگاہوں کے رشتے اپنے وجود کو برہنہ سچ کی طرح پیش کررہے ہیں، شاید حدیں ٹوٹنے کے بعد ایک نئے انسان کے روپ و رنگ کو دیکھنے کی کوشش میں لگے ہیں دل و دماغ.....

ابھی کل کی ہی بات ہے جب پردے میں انسانی ہستی تھی، دھیرے دھیرے شعور کی رگ پھڑ کنے کے بعد اترتی ہوئی سڑکوں، گلیوں، پارکوں اور علاقوں میں ناچنے لگی، لباس کی مقدار کم ہونے لگی، حوا کی باحیا تصویروں میں ابھرے ہوئے خم، دل آویز خم سے آدم کا سر دلہو گرمانے لگا۔یہاں تک گرمایا کہ دونوں کے جسموں کی دوری میں بے چاری ہوا بھی اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکی۔

آندھیاں چل رہی ہیں، بادل چیخ رہے ہیں، سمندر بڑھ رہا ہے اور زمین دھیرے دھیرے اپنے وجود کا حصہ کم کرتی جارہی ہیں مگر انسان خود کو بنانے میں جٹا ہوا ہے، یہ میرے لیے،، یہ میری آنے والی نسلوں کے لیے۔اب تو وہ کلون کو بنا کر اپنے کو

ہمیشہ باقی رکھنے میں لگا ہوا ہے۔ برق رفتاری نے اس کو آنے والے لمحوں، دنوں، سالوں اور صدیوں کا مالک بنا دیا ہے۔ بنا اس کی مرضی کے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ جہاں یہ سب ہو رہا ہے وہیں انسان بہت جلدی یکسوئی، یک رنگت سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے۔

مگر شاید کلون میں یہ مرض نہیں رہے گا۔ وہ تو ایسا ہوگا جو بالکل منفرد ہوگا۔ اعلیٰ ترین دل و دماغ، صدیوں پر بھاری عمر، نہیں نہیں جب تک وہ نہیں چاہے گا اس کو موت نہیں آئے گی۔ بیماریوں سے پاک وصاف جسم لیکن یہ خودی کا سحر کہاں تک جائے گا۔ یا پھر لوٹ کر وہیں آئے گا جہاں سے پہلی بار چلے تھے۔

ان کی ہستی میں کنڈوم کے علاوہ اور کیا ہوگا۔ استعمال...؟ آبادی کو بھی تو کنٹرول کرنا ضروری ہے... آسان سانسخہ، یہی تو بتاتے ہیں بے چارے اشتہار۔

☆☆

مضطرب خواب

میں دیکھ رہا ہوں کہ طوفان نے دھرتی کے ایک مخصوص خطے کو اپنی گرفت میں لے کر تباہی، بربادی کے وہ نقش ونگار قائم کر دیئے ہیں جو آنے والی نسلوں تک کو صاف دکھائی پڑیں گے۔

میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ طوفان مختلف شکلوں میں انسانوں کے درمیان موجود ہے....بے چارہ انسان....!

مگر انسان...نبرد آزما انسان!! شیطان صفت انسان!!! جو اپنے چیلوں کے ذریعے جنگ جاری رکھے ہوئے ہے۔کیا خبر؟ کہ غالب کون ہوگا؟

میں تو ٹھہرا ہندوستانی، ترقی پذیر انسان! اپنا نقش بنانے کے لئے لگن اور محنت کے ساتھ جدوجہد کر رہا ہوں، تب کہیں جا کر کوئی جوہر نمایاں ہوتا ہے مگر جو لوگ ترقی یافتہ ہیں وہ کیا کر رہے ہیں...؟ کیا بندشیں عائد کرنا ان کا پیدائشی حق ہے؟ کہیں دودھ بند تو کہیں ہتھیار بند...انسانی خود ساختہ قدر و قیمت کے نمائندے... پوری دھرتی کو اپنا سمجھ کر حکم صادر کر رہے ہیں۔

میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ پھول کی شادابی اور خوشبو کا سودا ہو رہا ہے۔تجارتی ذہن کو تو منڈی چاہئے۔

ترقی یافتہ...ترقی پذیر ممالک میں جنگ جاری ہے، جو ہر شعبۂ حیات میں دیکھی جا سکتی ہے مگر جو نا تو ترقی یافتہ ہیں اور نہ ہی ترقی پذیر ان کو کیا اس دھرتی سے نکال کر

مہتابی سطح پر بسایا جائے گا؟

انسانی ذہن لطیف جذباتی اور آفاقی رشتوں کو تعمیر و ترقی کے لئے استعمال کرے گا...؟ انسان طوفانوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہ امن و امان تو چاہتا ہے مگر اپنے لئے... وہ سب سے منفرد کہلائے چاہے جتنے جذبات و احساسات مجروح ہو جائیں۔ قتل و غارت گری ہو جائے۔ انتہائی گرم ماحول ہو جائے۔ صدیوں کا مضبوط آپسی بھائی چارہ ٹوٹ جائے۔ بلا سے۔

میں دیکھ رہا ہوں۔ انسان.... انسان کو غلام بنا رہا ہے۔ زمانۂ قدیم میں غلاموں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی تھی وہ بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکائے جاتے تھے مگر آج کے غلام ذہنی غلام ہیں۔ وہ بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہیں۔ عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن ان کی سوچ پر پہرے لگے ہیں۔

جدید انسانی ذہن سوچ و فکر میں لگا ہوا ہے کہ کس طرح سے اپنی حکمت عملی کو وسیع کر کے سلطنت قائم کی جائے۔ سر جھکانے والی قطاریں دیکھ کر دلی سکون حاصل کرنے کا خواب سب دیکھ رہے ہیں... خواب بہر حال خواب ہوتا ہے خواب پر پابندی عائد کرنے کا حوصلہ تو انسانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ شاید ترقی یافتہ نسل یہ حق بھی نہیں دینا چاہتی۔

میں دیکھ رہا ہوں۔ انٹرنیٹ کس طرح انسانی جسم و جذبات کی ایک ایک پوشیدہ رگ و ریشے کو اجاگر کر کے تجسس ختم کر رہا ہے اب کسی بات پر کوئی بات نہیں ہوتی، یہ سب تو معلوم ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہے دن، ماہ، سال کا فرق اب کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ جو بچے سمجھے ہیں وہی بوڑھے لوگ...

آخر یہ برق رفتاری کہاں لے جائے گی؟ یا گر گر کر سب کچھ تباہ و برباد کر جائے گی۔ انسانی تعمیر....... انسانیت کی تعمیر... دھرتی پر مختلف شکلوں میں موجود طوفان ...ٹکراؤ کی ہولناکیاں... سکون کی چاہت میں پریشان رشتے... خوف و دہشت سے لبریز

دن رات.... کیا یہ انسانی دنیا ہے؟

میں یہ تمام مناظر دیکھ کر بے حس ہو چکا ہوں احساسات اور جذبوں کا ابال اب نہیں اٹھتا...

شیطان صفت انسانوں نے بے حسی پن سے لطیف جذبوں کو پامال کر دیا ہے ان کو تو کام چاہئے۔ بے حس انسان صرف اپنے میں ہی مست و بے خود رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اپنے لئے جی اور مر رہے ہیں۔

مگر جو احساسات اور جذبوں کا مالک ہے۔

تغیر

اورام جی بڑا دکھ دی نا۔ تیرے لکھن نے.....وہ گانا گاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ کافی تیز آواز تھی اس کی۔ لوگ مڑ مڑ کر اس کو دیکھ رہے تھے اور مسکرا بھی رہے تھے مگر وہ ان سب سے بے نیاز گانا گاتے ہوئے پیدل چلا جارہا تھا۔ کالی، چکنی سڑک جو کشادہ بھی تھی۔ اپنے میں مست و بے خود تھا وہ.....۔

معمول کے مطابق ہر صبح وہ پتھر توڑنے کے لیے کام پر نکل جاتا تھا۔ یہ کوئی تیس روپے روز کما لیتا تھا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کام تو کچھ کرنا ہی پڑے گا پتھر توڑنے کا کام بڑی محنت اور لگن سے کرنا پڑتا تھا۔ ذرا سی چوک انگلیوں کو زخموں سے بھر دیتی تھی اور پھر ہفتوں نہیں مہینوں سینکنا ہوتا تھا۔

وہ پتھر توڑنے میں ماہر ہو چکا تھا۔ اس کے توڑے ہوئے پتھر نگینے کی طرح پہچان رکھتے تھے۔ ٹھیکے دار اس کے کام سے بہت خوش رہتا تھا اور کبھی کبھار جب شام کو چائے ہنڈے میں آتی تو اسے بھی مل جایا کرتی تھی یہ اس کے لیے بڑی بات تھی۔ اس کے دیگر ساتھی اس کے چائے ملنے کا تذکرہ اس طرح کرتے جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔ یا رتبہ بلند ہو گیا ہو۔

دھول، دھوپ اور پسینہ وہ نہیں جانتا تھا۔ ہاں احساس ضرور ہو اٹھتا تھا مگر دوسرے ہی پل دوسرے مزدوروں کو ملتی گالیاں اور پڑتی ہوئی ٹھوکریں دیکھ کر وہ اور انہماک سے پتھر توڑنے میں لگ جاتا تھا۔

اس کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا باپ بھی پتھر توڑنے کا کام کرتا تھا۔ اس

نے جب سے چلنا سیکھا تھا تب سے ہی اپنے باپ کے ساتھ پتھر توڑنے کی جگہ آنے جانے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ اکیلا نہیں تھا اور بہت سے اس کے جیسے تھے وہ بھی ان پتھروں کے درمیان کھیلا کرتا، دوڑا کرتا اکثر جب گر پڑتا تو چوٹ لگنے کی وجہ سے رونے بھی لگتا تو بجائے اٹھانے کے میرا باپ کہتا اٹھ جا بیٹا.... اٹھ جا۔ تجھے چوٹ نہیں لگی ہے۔ تو تو پتھر توڑنے والے کی اولاد ہے۔ چل اٹھ جا.... اسے بخوبی یاد آ رہا ہے کہ وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

ایک بار نہیں متعدد بار ایسا ہوا تھا۔ پتھر توڑنے والوں کا دل فولاد کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی یہ کہتا تھا۔ اس کی ماں بھی پتھر توڑتی تھی۔ اس کے ماں باپ گاؤں سے بھاگ کر اس پتھر نگری میں روٹی روزی کی تلاش میں آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اب نہ تو ماں تھی اور نہ ہی باپ، صرف وہ تھا اور اس کا پتھروں کو توڑنے کا کام۔ مہینواری ہوٹل میں ناشتہ اور کھانا کھاتا پھر آ کر اپنی کھولی میں سو جاتا۔ یہ اس کی زندگی کا دستور تھا۔

اچانک ایک دن جب وہ اپنے پتھر توڑنے کے کام پر جا رہا تھا تو اس کے دیگر ساتھیوں نے انکار یہ کہہ کر کر دیا کہ یومیہ مزدوری کم ہے اور بڑھائی جائے تب ہم لوگ کام کریں گے۔ ورنہ نہیں.... اوروں کی طرح وہ بھی کام کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ سوال؟ مزدوری بڑھانے کا جو ٹھہرا۔

اس نے پہلی بار مزدوروں کو پتھر توڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ایک جم غفیر تھا جو یومیہ مزدوری بڑھانے کی مانگ کر رہا تھا۔ اللہ کی پناہ کس بے دردی سے لاٹھیاں برسی تھیں۔ کسی کا سر پھٹا تو کسی کا ہاتھ ٹوٹا۔ خون، آہ و فغاں کچھ دکھائی سنائی نہیں دے رہا تھا پھر اچانک لاٹھیوں کے جواب میں پتھروں کی بارش ہونے لگی، میدان میں لہو بہنے لگا، مزدور گر رہے تھے، بھاگ رہے تھے، اب پولیس والے گر رہے تھے، بھاگ رہے تھے مگر یہ ماحول کچھ ہی دیر رہا ہوگا کہ گولیوں کی بھیانک آوازوں سے پورا علاقہ اور مزدور تھرا اٹھے.... کئی سو مزدور، بے گناہ مزدور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہزاروں

کی تعداد میں زخمی ہو کر لولے لنگڑے ہو گئے، بچے یتیم عورتیں بیوہ ہو گئیں پتھر نگری میں چاروں جانب دہشت، وحشت کا عالم پھیل گیا۔

بربریت کا ننگا ناچ، یہ مظالم دیکھ شاید اب کوئی یومیہ مزدوری بڑھائے جانے کی بات سوچ بھی نہیں سکے گا۔ اتنی بڑی سزا، کیا؟ سزا اور جزا کا میزان آ گیا تھا۔ ایسا نہیں!

آواز کو دبایا نہیں جا سکتا۔ سورج کی کرنوں کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ زمانہ یہی کہے گا۔ نہیں؟ کبھی نہیں؟؟۔

لیکن یہ سچ ہے وہ جو دیکھ رہا تھا کہ پتھر نگری کی آواز گونج کر خاموش ہو چکی تھی۔ آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑیاں اپنے دامن میں پتھر توڑنے والے مزدوروں کی داستانوں کو سمیٹے ہوئے ساکت ہو چکی تھیں مگر وقت سب سے بڑا مرہم کہا جاتا ہے۔ اور اس لیے کہ تجارتی فکر و نظر اور زیادہ پیسہ کمانے کی چاہت نے جو بازاری فضا پیدا کی اس نے پتھر توڑنے والے مزدوروں کی مزدوری ہی نہیں بڑھائی، عزت بھی بخشی، ان کی اپنی زندگی کا معیار بھی بدلا اور وہ اب اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی دھیان دینے لگے۔ اور پھر جب ان میں شعور بیدار ہوا تو بڑی بڑی یونینیں بنا کر زیادہ تنخواہیں اٹھانے لگے۔ بہتری کی چاہ میں کم سے کم کام کرنا پڑے اور اجرت زیادہ سے زیادہ ملے، ذہن بن سا گیا۔

یہ تغیر.... کیا ہمارے معاشرے میں ترقی کو فروغ دے رہا ہے؟ یا ملک و قوم کے سامنے ایک مشکل کھڑی کر رہا ہے.... آئیں ... ہم سب مل بیٹھ کر غور و فکر کریں کہ آخر خرابی کہاں پیدا ہوئی ہے....!!

تبدیلی

پیدا ہونے اور مرنے کا سلسلہ روزِ ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہے گا۔
حقیقت کی آنکھیں دیکھتی اور سنتی چلی آ رہی ہیں کچھ شمار کرنے کی سعی کرتے ہیں اور کچھ عقل وفہم سے بالاتر بتاتے ہیں۔

زندگی رواں دواں ہے، آنکھیں دیکھنے میں اور ذہن سوچنے میں مشغول ہے کہیں یہاں تو کہیں وہاں، انسان کس قدر مدہوش وغافل ہے اپنے میں، یہ جانتے ہوئے کہ جو دنیا میں آیا ہے اس کو مرنا بھی ہے، حیرت کا پہلو یہ ہے کہ انسان خود کو نا قابل تسخیر سمجھتا ہے اور اپنی سالمیت اور بقاء قائم رکھنے کے لیے نت نئے ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے جیسے کہ دنیا میں ہمیشہ ہی رہنا ہے ہاں زندگی تو چلتی رہے گی۔ لوگ آتے جاتے رہیں گے لیکن زندگی میں امن واماں، سکون وعافیت اور ایک دوسرے کے لیے دردمندی، رنج وغم بانٹنے اور آنسو پوچھنے والے افراد، نفرت، قتل وغارتگری کو روکنے والے، انسانی عظمت، جذبوں کو بڑھانے والے دماغ، بچوں، بوڑھوں کی مدد کرنے کی فکر انسان پر انسان کی بربریت اور حکومت۔ افکار اور کاوش میں مچی ہوئی جنگ، بدلتے ہوئے منظر کے درمیاں یہ بھی لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ایک بچہ، ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہوئے، سینہ تانے ہوئے کھڑا ہے اور اس کے سامنے نوجوان فوجی جدید ترین اسلحہ لیے ہوئے، بھلا کیا مقابلہ؟ بچیاں ہاتھوں میں اٹھائے تختیاں، ''ہمیں ہمارا ملک دو''۔ ''نسل کشی بند کرو''۔ ''بے گناہ بند فلسطینیوں کو آزاد کرو۔ آزاد کرو''۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔

شاید لوگوں کے ذہنوں میں نسلی برتری کا جذبہ ہو۔ انسانوں کے ساتھ ظلم کے مناظر، عورت اور آدمی برہنہ حالات میں ایک ساتھ بندھے ہوئے۔ آدمی کے ساتھ اور اوپر نیچے بندھا ہوا ننگا آدمی، فاتح لوگ مزا لیتے ہوئے، تاریخ بناتے ہوئے۔ انسانیت شرمسار، جنگی قیدیوں کیساتھ نازیبا سلوک۔ غریب کے واقعات لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اعلانات ہو رہے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں کہ شخصی آزادی کا بھرپور قانون ہمارے پاس ہے، عورتوں کو برابری کا مکمل درجہ ہم نے دے رکھا ہے۔ دیکھو دیکھو، مریخ بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں، ہمارا ایک سپاہی مرتا ہے تو پوری قوم چیخ اٹھتی ہے، اسرائیل اور عرب ہمارے دوست ہیں لیکن ان میں یہود ہمیں سب سے پیارا ہے۔ غلط صحیح، صحیح غلط، حقیقت اپنی اپنی، شناخت اپنی اپنی.... لوگ دیکھ رہے ہیں۔

دیواریں ٹوٹ رہی ہیں اور دیواریں بلند بھی کی جا رہی ہیں، ذہن بنائے جا رہے ہیں، خوشحالی بانٹی جا رہی ہے، ترقی کا کچرا وہاں پھینکا جا رہا ہے جہاں کے لوگ انسانیت سے دور اصولوں سے دور نہیں اپنے تمدن میں غرق کمزور انسان کو پکا کر کھا رہے ہیں، آفتاب جغرافیائی لحاظ سے نزدیک۔ پیڑ پودھے بھی انسانی لہو کو پسند کرتے ہیں، روتے ہیں، قہقہہ لگاتے ہیں۔ گہرے سمندر اپنے پاس رکھتے ہیں، قصے کہانیوں کی طرح دیو رکھتے ہیں مگر اس کے بعد بھی ان کے پاس دھڑکتے ہوئے دل ہیں، مچلتے ہوئے جذبات ہیں۔ وہ بھی ناخواندگی کے حصار کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور بلندیوں کو چومنا چاہتے ہیں۔ کالے جسموں میں سرخ لہو، گورے جسموں میں سرخ لہو... جسم کی رنگت کچھ بھی ہو مگر لہو کی رنگت ایک ہے سرخ، صرف سرخ!!! لوگ دیکھ رہے ہیں۔

پیار کرتے ہوئے، مچلتے ہوئے، دھڑکتے ہوئے خوبصورت جسموں کو۔ اپنے دائرے میں لیے ہوئے اور کہیں ٹوٹتے ہوئے، کہیں نئے بنتے ہوئے دائرے۔ بہاروں کے ساتھ ترنگیں، فضاؤں میں لہراتے ہوئے گیت۔ کس کے لیے کون؟؟۔ بارود کی گندھ ہر جگہ محسوس کی جا رہی ہے، دبنے اور دبانے میں قوتیں خرچ ہو رہی ہیں۔ ہر

شخص! موت کو گلے لگا رہا ہے۔زندگی نچھاور کرتے ہوئے اور زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے مناظر دیکھتے جارہے ہیں لوگ دیکھ رہے ہیں۔

بے زبان اور بے حس لوگ دیکھ رہے ہیں۔

وہ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ کوئی آسمانوں کی بلندیوں کو چیرتا ہوا زمین پر اترے گا اور پھیلے ہوئے ظلم وستم کے سیاہ باب کو ختم کر کے انسانی اقدار کو قائم کرے گا۔ انسانیت کو مرہم دے کر نفرت کو ختم کردے گا۔بے چین و بیقرار انسان تفکرات میں غرق ہو کر فضاؤں میں تبدیلیوں کے رونما ہونے کے منتظر ہیں۔اور دیکھ رہے ہیں، آپس میں سوالات کر رہے ہیں؟... کہ کیا؟

تبدیلی رونما ہوگی؟....

☆☆

جہاں۔ اپنا اپنا

کافی دیر بعد حامد پلنگ سے اٹھا۔ رات تین بجے تک اس کو نیند نہیں آسکی تھی، حامد بیتے ہوئے دنوں میں اپنے حالات پر غور وفکر کرتا رہا۔ سوچتے ہوئے کبھی تو وہ مسکرانے لگتا اور کبھی افسردہ ہو جاتا تھا۔ اس کی بیوی جو اس سے کچھ دوری پر ہی فرش پر لیٹی ہوئی تھی، اس کی حرکتوں کو بغور دیکھ رہی تھی، اس نے کئی بار حامد کو ٹوکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ہاں، ہوں کے علاوہ گاڑی آگے بڑھ نہیں سکی۔

ایک بار تو اس کی بیوی نے بانہہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ جمیل کے ابا، یہ تم کو کیا ہو رہا ہے؟ بدن میں درد ہو رہا ہو تو میں دبا دوں۔ تو کیوں مجھے پریشان کر رہی ہے؟ چل جا کے سو جا نہیں تو دو چار ہاتھ جڑ دوں گا۔ حامد غصے میں بولا۔

شوہر کی مار کا تصور کرتے ہی وہ چپ چاپ فرش پر لگے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ ابھی تین دن پہلے کی گئی پٹائی کے نشانات اس کی پیٹھ پر موجود تھے، وہ انہیں سہلاتے ہوئے بائیں کروٹ لیٹ گئی۔

بہر حال صبح کی ہوتی ہوئی اذان نے اِسماء کو بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جمیل کو تیار کر کے اس کو اسکول بھیجنا تھا۔ ناشتہ بنا کر بابو جی کو دینا تھا۔ گھر کے اور دیگر کام تھے جو اس کو کرنے تھے۔ یاد آتے ہی وہ غسل خانے کی جانب چل دی۔ جمیل بیٹے اٹھ جاؤ کی آواز دینا وہ بھولی نہیں تھی۔

غسل خانے میں اس کی ساس پہلے سے موجود تھی، اِسماء بے چینی سے کبھی

کمرے میں جاتی تو کبھی غسل خانے کا دروازہ تکتی۔ اسماء اپنی ساس کی زیادتیوں سے بہت پریشان رہتی، ہر بات کو شیطان کی آنت کی مانند لمبا کیا کرتی رہتی، ہر لمحہ بات بدلتی رہتی تھی اور بے سرے بول آنگن میں گونجتے رہتے تھے۔ گھبرا کر کبھی کبھی بابو جی بول اٹھتے کہ خدا کے لیے اب بس بھی کرو۔ بہو کام تو کر رہی ہے تم بے مطلب اس کے پیچھے پڑی ہو۔ جاؤ عصر کی نماز پڑھ لو۔ میں پڑھ چکا ہوں۔

حامد اپنی بیوی، بابو جی اور اماں کی باتوں کو سنکر اکثر پریشان ہو اٹھتا تھا۔ وہیں اپنی نوکری میں آئے دن کی ہوتی چھٹی سے تنگ دستی محسوس کرتا تھا۔ خود کو ملا کر پانچ نفر کا خرچ، ناطے رشتے دار، مرض، شادی اور دیگر اخراجات اس کو بے چین کیے رہتے تھے مگر حامد پھر بھی اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ ہاں، اپنے دل و دماغ میں بھرے غصے کو بیوی سے مار پیٹ کر کے ظاہر کرتا رہتا تھا۔ ایسا کر کے وہ تھوڑی دیر کو کچھ سکون محسوس کرتا مگر اس کے بعد اس کی بے چینیاں اور بڑھ جایا کرتی تھیں، بیوی کا بے قصور چہرہ اور جمیل کا دہشت بھرا معصوم چہرہ، اس میں وہ چنگاریاں بھر دیتا تھا۔ یہاں تک کے وہ خود پر لعنت بھیجنے لگتا تھا۔

حامد جب شام کو اپنے گھر آفس سے واپس آتا تھا تو بغل میں رہ رہے مولوی صاحب کے یہاں عورتوں، مردوں کی بھیڑ لگی دیکھتا۔ بلکہ ایک میلہ سا ہوتا تھا ان کے یہاں حاجت مندوں کا۔ دوکان نہیں چل رہی ہے، لڑکا کام نہیں کرتا، سالوں سے بیمار ہوں، شوہر پیار نہیں کرتا، لڑکی کا رشتہ نہیں آرہا ہے، دلہن خوبصورت اور سسرال مالدار ملے، آدمی جوا، شراب میں مست رہتا ہے، لڑکے کو ملازمت مل جائے، امتحانات میں کامیابی مل جائے، تبادلہ رک جائے، برسوں سے پریشان ہوں، مجھے الیکشن میں اب کی بار کامیابی ضرور ملے، غرض یہ کہ ہر زبان پر ایک تمنا التجا ہوتی تھی، کوئی مولوی صاحب کے ہاتھ چوم رہا ہوتا تو کوئی پیر دبانے میں مصروف، مٹھائیاں، پھول، نذرانے پیش کیے جا رہے ہوتے، عقیدت و احترام کا ایک بازار ہر روز موجود رہتا تھا۔ کشف و کرامات

کے چرچے ،زندہ ولی ہونے کی نشانیاں اجاگر کرتے ،مرد عورت، جواں خوبصورت لڑکے لڑکیاں، مال دولت کا انبار، شان وشوکت کے ساتھ... مولوی صاحب گنڈے، تعویز، جھاڑ پھونک کرتے اور دعائیں دیتے ہوئے، خدمت خلق میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔

حامد اپنی بیوی اسماء سے مولوی صاحب کے بارے میں سنی ہوئے باتوں کو بتایا کرتا تھا تو اسکی بیوی جل بھن جاتی تھی اور بہت ہی کڑوے لہجے میں جواب دیتی کہ بڑے آئے کراماتی، ارے پہلے اپنی پگلی لڑکی کو تو ٹھیک کرلیں جو ہر وقت گھر کے اندر بندھی پڑی رہتی ہے اور ذرا بھی کھلی ہونے پر اپنے جسم کے تمام پہنے ہوئے کپڑوں کو پھاڑ دیتی ہے، اللہ جھوٹ نہ بلائے پوری کی پوری جوان ہو چلی ہے...اور حامد برا سا منہ بناتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آتا۔ حامد کے کئی دوست مولوی صاحب کے نام لیوا اور مرید تھے اور دیگر لوگوں سے بھی اس نے مولوی صاحب کی تعریف سن رکھی تھی ان کے یہاں انتظامیہ کے افسران، صحافی، فنکار، سیاسی وسماجی افراد اور دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی بھی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مولوی صاحب نے جس کسی سے بھی جو کچھ کہہ دیا۔ حکم کی تعمیل میں دیر ہو یہ ممکن نہ تھا۔ حامد نے بھی کئی بار سوچا کہ مولوی صاحب کو اپنی باتیں بتا کر مدد کی درخواست کی جائے۔ ملازمت میں اس کی بھی ترقی ہو جائے اور ساس بہو میں پیار پر سکون زندگی عیش وعشرت نہ سہی مگر ضروریات زندگی میں تنگی ضرور ختم ہو جائے لیکن جب بھی اس نے اسماء سے مولوی صاحب کے یہاں جانے کی بات کی تو وہی پرانی لڑکی والی بات بتا کر اسماء اس کو بددل کر دیتی تھی مگر حامد کے ذہن میں پھر بھی یہ ضرور رہتا کہ اگر فائدہ نہیں ہے تو لوگ بیان کیوں کر رہے ہیں، آ کیوں رہے ہیں؟؟

ایک دن اسماء نے حامد کو بتایا کہ بابو جی کو ایک ہفتہ ہو رہا ہے وہ مولوی صاحب کے یہاں برابر شام کو جا رہے ہیں، ایک نہیں کئی گھنٹے بعد آتے ہیں اور ساتھ ڈھیر ساری مٹھائیاں بھی لاتے ہیں لگتا ہے بابو جی پر مولوی صاحب کا رنگ چڑھ رہا ہے...

تم یہ باتیں اتنی دیر بعد مجھے کیوں بتا رہی ہو؟ اب میں سمجھا... ہنستے ہوئے حامد اپنی بیوی اسماء سے بولا... اور اسماء حامد سے کہہ رہی تھی کہ اب مجھ سے نہیں بابو جی سے پوچھ لینا۔ وہ کیوں مولوی صاحب کے یہاں جا رہے ہیں؟.... اچھا اچھا کہتے ہوئے حامد کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ رات کا کھانا حامد اور اسماء ساتھ کھاتے تھے۔ بابو جی، جمیل اور اماں یہ بھی الگ ایک ساتھ رات کا کھانا کھاتے۔

بابو جی کو تقریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگے، بابو جی اور اماں کے ساتھ رہنے سے اخراجات بڑھ چکے تھے، بابو جی کو پنشن بہت تھوڑی ملتی تھی کیوں کہ وہ پوسٹ آفس میں ملازمت کرتے تھے اور بابو جی کے نام سے مشہور تھے اوپری آمدنی کا کوئی تصور ان کے پاس نہ تھا۔ شریف النفس اور کام کرنے میں بہت تیز تھے، عوام کو کوئی شکایت ان کی ذات سے کبھی نہیں رہی مگر سبکدوشی کے دو سال بعد بابو جی کے طور وطریقے میں زبردست فرق آچکا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنا بڑا نقصان کیا۔ اتنی مختصر سی پنشن میں زندگی گذارنا ممکن نہیں ہے، لڑکا لائق ہے جو گاڑی کھینچ رہا ہے ورنہ ماتھے کا پسینہ ایڑیوں میں آجاتا۔ ملازمت کے وقتوں میں بیوی کی فضول خرچی سے عاجز رہا کرتا تھا اب تو اور تنگ کرتی ہے۔ بہو کو اس کی وجہ سے کافی پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔

حامد اپنے ماں باپ کی دلی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ اپنی ماں کو الگ سے کچھ نہ کچھ روپیہ ہر ماہ ضرور دے دیا کرتا تھا۔ جس کو لے کر بیوی سے الگ مار پیٹ بھی ہو جایا کرتی تھی اور نہ دینے پر ماں، بابو جی کو سوتے اٹھتے، بیٹھتے جلی کٹی سنایا کرتیں اور کوسا بھی کرتی تھیں۔ جس سے پورے گھر کا امن وچین درہم برہم رہتا تھا۔

اماں جہاں اپنی صحت کا پورا خیال رکھتیں وہیں اپنے پوتے جمیل کیلئے نئے نئے کپڑے لاتیں اور جمیل کی ہر فرمائش کو پورا کرتیں، حامد اماں کے اس لاڈ و پیار پر اکثر کہتا رہتا کہ اماں اس سے جمیل کی عادتیں خراب ہو جائیں گی مگر اماں پر اس کا کوئی

بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔

حامد نے ایک دن اپنی اماں سے کہا کہ بابو جی روز مولوی صاحب کے پاس جاتے ہیں، ہم لوگوں کو بھی ترقی ملے مولوی صاحب سے دعا کروائیں۔ سب کے لیے کرتے ہیں، اپنوں کے لیے بھی تو کچھ ہو۔ ان دنوں کافی دقتوں میں ہوں۔

اماں نے فوراً ہی بابو جی سے کہا۔ ارے سنتے ہو، حامد کہہ رہا تھا مولوی صاحب سے ہم لوگوں کے لیے بھی دعا کرا دو تا کہ ہمارے گھر میں بھی چار چاند لگ جائیں۔

جب اماں بابو جی سے یہ سب کہہ رہی تھیں تو حامد دوسرے کمرے میں ان کی بات چیت سن رہا تھا۔

ارے بیوقوف بابو جی بول رہے تھے مولوی صاحب میں کچھ بھی کرامات نہیں ہے انہوں نے تو اپنے آدمیوں کو چھوڑ رکھا ہے جو لوگوں کو فریب دے کر ان کے پاس لاتے ہیں اور اپنا طے شدہ کمیشن پاتے ہیں۔ رہی فائدہ کی بات تو اس دھندے میں تعلقات بہت جلد بن جاتے ہیں، مشکل سے نجات کی چاہ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں، اس میں شہرت بنائی جاتی ہے۔ ایک بار دھندہ چل بھر جائے تو سمجھو ساری پریشانیاں ختم۔ مولوی صاحب کا ڈنکا اس وقت بج رہا ہے، ان کی تو چاندنی ہی چاندنی ہے۔ میں تو اپنا وقت کاٹنے چلا جاتا ہوں، مٹھائیوں کے ساتھ رقم بھی مل جایا کرتی ہے۔ حامد کو سمجھا دینا ان کے چکروں میں مت پڑے سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں ہے۔

بابو جی کی باتیں سن کر حامد کو چکر سا آ گیا۔

کاش.......

آج کلو بہت اداس تھا۔

کلو جب اسکول جانے کے لیے اپنی چھوٹی بہن جلو سے پوچھ رہا تھا کہ اس کی کتابیں کہاں ہیں؟ تبھی اس کا باپ آ گیا۔ کلو کا باپ پیشے سے موٹر انجن مستری تھا اس کا نام یوں تو جواد تھا لیکن ٹرانسپورٹ نگری میں جہاں وہ موٹر گاڑیوں کے انجنوں کی مرمت کرتا تھا جوا کر کے مشہور تھا۔

جوا بالکل انگوٹھا چھاپ تھا مگر دماغ خدا کی پناہ..... پل بھر میں ہی انجن کا عیب پکڑ لیتا تھا۔ موٹر مالکان اور دیگر پیشے سے منسلک لوگ اس کے دماغ اور ہنر کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ جوا اپنی اس خوبی سے پوری طرح واقف بھی تھا اور نازاں بھی، وہ جب خوش ہوتا تو اپنے لڑکے کلو کو سمجھاتا کہ دیکھو میں تو ایک لفظ بھی نہیں پڑھا لکھا ہوں مگر لوگ مجھے کتنا مانتے جانتے ہیں، میرے دماغ کا لوہا مانتے ہیں اور تو ہے کہ ہر وقت پڑھائی لکھائی کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اپنے پیشے میں دماغ لگاؤ۔ چار پیسے اگر ابھی سے کمانے لگو گے تو آگے کام آئیگا.. ..تین درجہ تو نے اپنی ضد سے پڑھ لیا ہے اب اور کتنا پڑھے گا؟ ساری عمر پڑھنے لکھنے میں ہی خراب کر دو گے تو کماؤ گے کب؟ جب عمر نکل جائے گی تب۔

کلو کا باپ جوا اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔ کلو کی ماں بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھی۔ ماں کی ممتا اس نے صرف سنی تھی مگر اس کے باپ جواد نے اس کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ کلو کا ذہن پڑھنے لکھنے میں لگتا تھا کیونکہ اس نے اپنے دوستوں کو دیکھا تھا کہ وہ روز صبح اپنے بستوں کے ساتھ اسکول آیا جایا کرتے تھے، ان کے کپڑے صاف ستھرے ہوتے

مگر کلو میلا کچیلا بنا رہتا تھا۔ ہفتے میں جمعہ کے روز صرف نہاتا تھا۔

صاف ستھرے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے محلے کی مسجد میں جایا کرتا تھا اور جس طرح لوگ نماز پڑھتے اسی طرح خود بھی کرلیا کرتا تھا۔ اس کا دل بے چین رہتا تھا کہ وہ بھی پڑھے، اس کی بھی معلومات میں اضافہ ہو مگر باپ کا کاروبار میں لگ جانے پر زور دینا اس کو اور زیادہ بے چین کر دیتا تھا۔ کلو اپنے باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔

کلو نے کئی بار اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ تعلیم کے ذریعے ہی انسان ترقی کرسکتا ہے مگر اس کا باپ ہر بار اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہتا ''تم میرے ساتھ آؤ میں تمکو دکھاؤں کہ کتنے لوگ تعلیم حاصل کر کے بھی بے روزگار گھوم رہے ہیں نوکری کو ترس رہے ہیں۔ ان کے ماں باپ کے دلوں سے پوچھو کہ انہوں نے کتنا پیسہ لگا کر پڑھایا لکھایا، بیش قیمتی وقت جس میں وہ کچھ کام سیکھ سکتے تھے تعلیم حاصل کرنے میں لگا دیا نتیجہ بیکاری کی شکل میں موجود ہے''۔ باپ کی اس دلیل پر کلو خاموش ہو جاتا تھا مگر اس کا یہ مطلب قطعی نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی باتوں سے پوری طرح مطمئن تھا۔

کلو اب اپنے باپ کے موٹر انجن مرمت کے کام میں لگ چکا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بلا کا ذہین تھا۔ موٹر کی آواز سن کر وہ انجن کی خرابی کو بتا دیا کرتا تھا۔ موٹر کے تمام پرزوں کے نام اس کو ازبر تھے۔ کلو کا بے قرار ذہن ہر وقت اس میں لگا رہتا کہ اس کو کچھ نئی بات معلوم ہو جائے، کھوج خبر کی اس چاہ نے اس کو باتونی بھی بنا دیا تھا۔ ایک ایک بات وہ پوچھتا تھا۔ یہاں تک کہ بتانے والا بھی اوب جاتا تھا۔ وہ معلومات چاہتا تھا کہ کبھی اس کو بڑی خجالت اٹھانی پڑتی جب اس کو اپنی تعلیم کی کمی محسوس ہوتی، کم تعلیم حاصل کرنے پر وہ اپنے باپ سے لڑ بھی جاتا تھا کہ آپ کی ہی وجہ سے کل تین درجہ تک ہی پڑھائی کرسکا۔ نہیں تو اور زیادہ ترقی کرسکتا تھا۔ اپنا خود کا کاروبار کرتا، فیکٹری لگا سکتا تھا مگر کم پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے زیادہ کچھ نہیں کر پا رہا۔ ابا۔ آپ کا زمانہ اور تھا یہ میرا زمانہ تعلیم کا ہے، ترقی کا ہے۔ شکر کے ساتھ امنگیں۔ اپنی تعبیر میں حوصلوں کے دوش پر سوار ہو کر کامیاب ترین کہلانے کو بیتاب ہیں۔

کلو کا باپ جو اب اپنے رویئے پر پچھتاتا تھا۔ کہ اس نے تعلیم حاصل کرنے سے کیوں کلو کو روکا؟ کچھ زیادہ پیسے کی چاہ میں اس نے کلو کی پڑھائی چھڑوا دی تھی اگر وہ گریجویٹ

ہو جاتا یا میکینکل انجینئر ہو جاتا تو کتنا اچھا ہو جاتا وہ خود بھی ترقی کرتا۔ اس کا نام بھی روشن ہو جاتا اور ساتھ ہی ساتھ اور بہت سے لوگوں کو کام بھی ملتا اور دیگر صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مدد ملتی۔ کلو کی مثالیں دے دے کر لوگ اپنے بچوں میں ہمت اور ولولہ بھرتے کتنا اچھا ہوتا۔ کاش میں کلو کی چاہت، اس کے جذبے کی قدر کرتا.... کاش.... کاش...

مگر جوآ کو اپنا بچپن بھی یاد آ رہا تھا۔ گھر میں بھائی بہنوں کے نام پر نو لوگ، لبا اماں ملا کر کل گیارہ لوگ مگر کمائی کے نام پر ابا مل میں بنتا چلاتے تھے بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ کھانے اور کپڑے کی قلت تو تھی ہی اوپر سے ابا کی خراب رہتی طبیعت نے اس کے گھر کی حالت کو اور خراب بنا دیا تھا۔

جوا کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ سات سال کا تھا تبھی اس کے ابا اس کو اپنے ایک دوست جو موٹر انجن مستری تھا کے یہاں کام سیکھنے کے لئے رکھ آئے تھے۔ جوا بھلا اس عمر میں کیا کام سیکھتا وہ چائے، پان، بیڑی اور رنچ وغیرہ لایا کرتا تھا۔ اس کا جسم موبی آئل سے ہر وقت کالا رہتا تھا۔

جوآ بہت ذہین تھا وہ من لگا کر موٹر انجن کے پرزوں کو دیکھتا۔ اس کے استاد جب موٹر انجن کھولتے اور باندھتے تو اس کا ذہن ایک ایک موٹر انجن پارٹس پر لگا رہتا مگر پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے نام جاننے کی پریشانی رہتی، اس کی زبان بھی موٹر انجن کے پرزوں کے نام لیتے وقت ٹوٹتی نہیں تھی مگر وہ پھر بھی لگا رہا۔ کچھ پیسے بھی مل جایا کرتے تھے اس سے جوا کے گھر کی روٹی بھی چل جاتی تھی۔

اس کو یہ بھی یاد ہے کہ جب تک وہ پورا انجن مستری نہیں بن گیا تھا اس نے کس قدر پریشانی اٹھائی، بھر پیٹ روٹی اور نئے کپڑے اس کو مخصوص وقتوں میں ہی مل پاتے۔ ہاں اس کے استاد اس کو اپنا بچا ہوا کھانا ضرور دے دیا کرتے تھے۔ جوا دھیرے دھیرے پورا انجن مستری ہو گیا مگر پڑھائی لکھائی کے نام پر وہ کورا کاغذ تھا۔

جوا اپنے ہونہار بیٹے کلو کو زیادہ تعلیم نہیں دلا سکا جبکہ اس کے پاس سب کچھ تھا جس کا اس کو دلی افسوس تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اچھی تعلیم اچھے مستقبل کی ضمانت ہے۔

☆☆

بوڑھا فقیر

واقعی وہ رحم کے لائق تھا۔اس کا جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح ہر جگہ سے رس رہا تھا۔اپنے عجیب وغریب ،تڑے مڑے ہاتھ پیروں کو دکھاتے ہوئے ''اللہ کے نام پر جو ہوسکے بابا، دیتے جاؤ۔تمہارا بھلا ہوگا'' صدا لگا رہا تھا۔

وہ کوڑھی اور اپاہج فقیر اسٹیشن کے عام راستے میں کنارے کی جانب پڑا رہتا تھا۔ لوگوں کا اپنا اپنا، الگ الگ اندازہ تھا۔کوئی کہتا تھا کہ میں نے اس فقیر کو بیس سال پہلے بھی اسی حالت میں دیکھا تھا،تو کوئی دس، پندرہ سالوں کی باتیں بتایا کرتا تھا لیکن کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس کو میں نے پہلے اس سے بہتر حالت میں دیکھا یا کہ اس کو میں نے فلاں حالت میں دیکھا۔یہ عجیب بات تھی کہ اس فقیر کے بارے میں کوئی بھی جانکاری نہیں دے سکا تھا کہ اس کو کون یہاں اس طرح چھوڑ گیا؟ یا یہ خود ہی یہاں آیا تھا۔

روز کی طرح جب میں آج بھی اس عام راستے سے گذرا تو اس کی یہی صدا کانوں میں سنائی پڑی ''اللہ کے نام پر جو ہوسکے بابا، دیتے جاؤ،تمہارا بھلا ہوگا''۔میرے من میں برسوں کا چھپا تجسس امنگیں مارنے لگا کہ یہ فقیر کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی ہیبت ناک شکل وصورت ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟........آخر میں بھی تو انسان ہی تھا۔میرے دل نے اس کی یہ دلدوز مجبوری، دکھوں سے بھری زندگی کا عبرتناک انجام دیکھ کر ہمدردی اور انسانیت کی قدریں یاد آنے لگیں اور میں یہ سوچنے لگا کہ اس فقیر کی مدد کرنی چاہئے۔میرے دل ودماغ میں خیالات کا ہجوم رقص کرنے لگا اور میرے قدم خود بخود اس کے سامنے جا کر رک گئے۔وہ اپنی صدا میں آنکھیں بند کئے ہوئے مگن تھا۔میرے وجود کی موجودگی کا اس پر

کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ لگاتار اپنی صدا کہے جا رہا تھا.........میں نے پل بھر کے لئے سوچا اب شاید اس کی آنکھ کھلے لیکن وہ تو بس.................

پھر میں نے خود ہی اسے آواز دی۔ ''بابا'' تب اس نے آنکھ کھولی اور بولا، ''جا، میرے پاس کیوں آیا ہے اگر تیرے پاس کچھ ہے تو دیتا چل۔ نہیں تو بھاگ...... یہاں سے بھاگ......'' میں چپ چاپ اس کی ہتک آمیز باتوں کا نوٹس لئے بغیر، اپنے راستے ہو لیا.............

مجھے آج یوں بھی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے تیز تیز قدموں کو اٹھاتا ہوا اسٹیشن سے باہر آ گیا مگر میرے دل و دماغ میں اس کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ذہن کی دنیا میں ہل چل سی مچی ہوئی تھی کہ آخر فقیر ہے کیا بلا؟ رہ رہ کر یہ خیال کوندر ہا تھا......اور میں کیوں اس کی جانب مائل ہوا؟ اور بہت سے تو فقیر موجود تھے۔

پتہ نہیں اس میں کیا کشش تھی کہ ذہن اس کی یاد سے غافل رہنا قبول نہیں کرتا تھا۔ بہر حال میں نے بھی اپنے من میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس فقیر کی تمام روداد ضرور معلوم کر کے رہوں گا۔ میرے دماغ میں اس کی تمام کیفیت موجود تھی۔ انسانی حاجت جو ہر فرد میں موجود ہے۔

آخر کون کراتا ہوگا؟.........کوئی تو ہوگا........اگر نہیں تو اس کے پاس غلاظت کا ایک ڈھیر موجود ہوتا اور سامنے سے گذرنے والوں کو ناک نہ دی جاتی لیکن ان تمام باتوں سے وہ پاک وصاف تھا بلکہ وہ اپنی پوری شکل وصورت میں موجود رہتا تھا۔

میں ایک دن صبح تڑکے ہی آ گیا لیکن تب بھی اس کی زبان پر وہی کلمات رواں تھے ''اللہ کے نام پر جو ہو سکے بابا، دیتے جاؤ۔ تمہارا بھلا ہوگا۔'' اور میں سارا دن گھوم گھوم کر اطراف میں جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بارے میں پوچھتا رہا لیکن نتیجہ سوائے صفر کے اور کچھ نہ ہو سکا، میں ہار بھی نہیں مانا۔ دل میں ہاں یہ ضرور آیا کہ کیوں بے وقوفی میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو؟ اچھے بھلے اپنے کام دھندے کو دیکھ۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں؟ تبھی کوئی غیبی طاقت کہتی نہیں.......اس راز کو جاننا تمہاری زندگی کا مقصد بھی ہے۔ تم کو ہر حال میں اس معمے کو حل کرنا ہوگا۔ لگاتار میں اپنی روح کی آواز پر اس فقیر کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ آخر

ایک دن ایک ایسے شخص سے ملاقات ہو ہی گئی جو مجھے برابر دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اسٹیشن کا ہی آدمی تھا۔ بہت عمر رسیدہ، میں نے بلا جھجک اپنا مقصد اس سے بیان کر دیا۔ تو وہ بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ اس کی ہنسی دھیرے دھیرے زہریلی ہوتی گئی۔ ''تو تم اس فقیر کی حالت کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہو۔ میں صرف تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ ایک بڑھیا عورت اپنے سارے جسم کو چادر سے ڈھکے ہوئے ٹھیک تین بجے رات کو روز آتی ہے؟ آج بھی ہم میں سے کوئی نہیں جانتا یا یوں سمجھ لو جاننے کی کسے فرصت ہے۔ تم اس سے مل لو، وہ بڑھیا عورت اس فقیر کے بارے میں بتائے گی کیونکہ وہی اس کو ضروریات سے فارغ کراتی ہے پھر اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ہے اور اسی طرح لٹا کر چلی جاتی ہے۔ وہ کون ہے؟ اور کیوں؟ کہاں سے آتی ہے روز؟ ہمیں نہیں معلوم۔ کس کو اتنی فرصت ہے جوان واقعات کو جاننے کی کوشش کرے''۔ میں اس عمر رسیدہ شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب ہو لیا جو کہ قریب ہی تھا.............

میں بڑی بے چینی سے رات کا منتظر تھا اور رات تھی کہ جلدی آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایک ایک پل ایسے بیت رہا تھا جیسے کہ صدیاں بیت رہی ہوں، خدا خدا کر کے کسی طرح رات کے دو بج گئے اور میں بے صبری کی تڑپ لئے ہوئے اسٹیشن کی جانب چل دیا اور مضطرب انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا لیکن میری نگاہوں کا مرکز وہی فقیر تھا اور جس کی صدا ابھی تک باز گشت کر رہی تھی ''اللہ کے نام پر جو ہو سکے بابا، دیتے جاؤ۔ تمہارا بھلا ہوگا''۔ میں بار بار اپنی گھڑی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ آخر کار گھڑی نے تین بجا ہی دیئے۔ میرے ذہن میں پورا پلان موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ضعیفہ اپنے تن کو میلی اور بوسیدہ سی چادر کے درمیان لپیٹے ہوئے بہت دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی چلی آ رہی ہیں، چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے چل پا رہی ہیں۔ چل نہیں رہی ہیں بلکہ خود کو گھسیٹ رہی ہیں۔

وہ ضعیفہ اس لاچار فقیر کے پاس بیٹھ گئیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ فقیر ان کی خوشبو پہچانتا ہو، وہ چپ ہو گیا تھا۔ بڑی محبت سے ضعیفہ نے اس کا منہ دھلایا اور اپنی میلی و بوسیدہ سی چادر سے پونچھا۔ اس کے بعد وہ اس کو کچھ کھلانے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ ضعیفہ نے اس فقیر کا سر

اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ میں دور تھا اور قریب آ گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس سے کچھ باتیں بھی کرتی جا رہی ہیں لیکن ان کی بات کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ میں نے دیکھا کہ ضعیفہ نے وہ سارے پیسے بھی بٹور لئے جو کہ تمام دن لوگوں نے ہمدردی یا ترس کھا کر اس کے سامنے پھینکے تھے یا لوگوں میں کہیں کچھ یہ بھی احساس رہا ہوگا کہ ہم نے سفیدی کا چولہ اوڑھ کر جو گناہ کئے ہوئے ہیں وہ شاید اللہ یا بھگوان یا کرائسٹ کے یہاں کم ہو جائے اور اس کے عوض کچھ ثواب ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔ پھر ضعیفہ نے جھک کر اس فقیر کی خون و مواد بھری پیشانی چوم لی اور کچھ کہنے کے بعد چل دیں۔

میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کافی دیر چلنے کے بعد وہ ضعیفہ ایک جھوپڑے کے سامنے رک گئیں۔ ضعیفہ بغل کی ریلوے لائن کے کنارے کنارے ہلتی ڈلتی چلی جا رہی تھیں، اوبڑ کھابڑ زمین طے کرتی ہوئی وہ کوئلے کے راکھی میدان میں آ پہونچیں۔ چاروں طرف کوئلے کی راکھ ہی راکھ، الگ الگ جگہ پہاڑوں کی شکل میں موجود تھی۔ میں بھی ادھر آج تک کبھی بھی نہیں آیا تھا.........سنا ضرور تھا کہ راکھی میدان میں حد درجہ غریب لوگ جگہ جگہ آباد ہیں، وہ بے پناہ گندی بستی ہے اچھے اور شریف لوگ وہاں جانا پسند نہیں کرتے بلکہ نفرت وحقارت کی نظروں سے وہاں کے رہنے والوں کو دیکھا جاتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ جہاں ضعیفہ رکی تھیں وہاں ایک پاگل سی لڑکی گڑے ہوئے بانس میں رسیوں سے جکڑی موجود تھی، وہ لڑکی ضعیفہ کو دیکھ دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی اور ناسمجھ میں آنے والی زبان میں بولنے لگی۔ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر یا ضعیفہ کو دیکھ کر ایک عورت جھوپڑے کے اندر سے نکلی، عورت نہیں کنکال نکلا لیکن وہ بہر حال عورت تھی۔ راکھ چھاننے والی عورت، اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ یہیں راکھ چھاننے کا آبائی کام کرتی ہے، ضعیفہ نے سارے پیسے جو فقیر کے در پر سے وہ خود لے کر کے آئی تھی اس کنکال عورت کو دے دیئے اور کہنے لگی کہ "دلاری کو دودھ منگا کر دے دے یا اور کچھ جو یہ کھائے، سن رہی ہے نہ بھاگ متی ....جلدی کر.........." وہ پاگل لڑکی بڑبڑانے میں مست تھی.........ضعیفہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور بھاگ متی شاید دودھ لانے کے لئے، لوٹا لینے اندر چلی گئی۔

کچھ دور ضعیفہ اور چلیں پھر انہوں نے چادر سے تالے کی چابی نکال کر جھوپڑے میں باہر کی جانب لگا تالہ کھولنے لگیں، میں دور کھڑا ان کی حرکات دیکھتا رہا، اب بالکل سویرا ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیلنے لگی تھی اور لوگوں کا نکلنا بیٹھنا شروع ہونے لگا تھا.......... صبح کی ضروریات کا بوجھ لئے ہوئے لوگ چلے جا رہے تھے، جس میں بوڑھے، بچے، نوجوان، عورتیں، بچیاں سبھی شامل تھے۔

میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا، ضعیفہ کے جھوپڑے کے سامنے آ گیا۔ پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر ''کوئی ہے'' کی آواز لگا دی.... دیکھا کہ ایک بہت ہی لاغر، جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے، اپنے سر پر دوپٹہ ڈالتا ہوا سامنے موجود ہو گیا۔ ''کیا بات ہے بیٹے؟'' میں ان کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ گیا۔ میرے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میری روح زخمی ہو چکی تھی، مجھ سے اور کچھ نہ بن سکا۔ سیدھے سوال داغ دیا۔ ''اسٹیشن پر جہاں آپ ہر روز رات میں تین بجے جاتی ہیں۔ وہ کوڑھی، لاچار فقیر آپ کا کون ہے؟'' میرے اس سوال پر اس ضعیفہ کا چہرہ فوراً تاریک ہو گیا لیکن یکا یک اس کے چہرے سے جاہ و جلال ٹپکنے لگا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ''وہ میرا سگا بھائی ہے۔ اُسے کوڑھی اور لاچار فقیر مت کہو، ظالم تو بھی انہیں لوگوں کا ساتھی معلوم پڑتا ہے، جنہوں نے میرے بھائی کی ایسی حالت بنائی ہے، بھاگ جا یہاں سے، نہیں تو میں تیرا خون پی لوں گی''۔ میں حیرت واستعجاب سے بھرا ہوا ضعیفہ کے یہ تیور دیکھ رہا تھا اور بھاگ جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔

میں اب جب بھی اسٹیشن کے عام راستے میں سے گزرتا ہوں تو میری نگاہوں میں عظمت واحترام کے پھول، اس فقیر کے لئے نچھاور ہوتے ہیں، جس نے اپنی بہن کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کر کے اس کی حفاظت کی اور انجام کار اپنی اس حالت کو پہونچ گیا۔

اس فقیر کی اس انسانیت دشمن حالت بنانے کے ذمہ دار کل بھی راکھ کے ہی ٹھیکے دار تھے اور آج بھی ہیں اور شاید کل بھی آب و تاب کے ساتھ رہیں گے۔

☆☆

بکھرا وجود

جانے بھی دو یہ تو ہونا ہی تھا۔

جبران نے ہنس کر اس کی بات ہوا میں اڑا دی، لیکن وہ اندر ہی اندر خود سے شرمندہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے اہم اور نازک راز کو، جس میں زبردست الجھاؤ بھی تھا کیوں بتایا؟

جبران کے لئے یہ تفریح کی بات ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے نہیں اس کی تو پوری زندگی داؤ پر لگی تھی۔ ہر شخص تو سنجیدہ نہیں ہوتا سب کا ذہن تو ایک جیسا نہیں ہوتا اور شاید کبھی ہوگا بھی نہیں۔

اس کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے جبران کے کتنے معاملات سلجھائے تھے حالانکہ یہ زمانے کی آب و ہوا بن چکی ہے کہ اپنا معاملہ حل کرو باقی کو بھاڑ میں ڈالو۔

آئینہ جس طرح صورت کا ہر عیب ظاہر کر دیتا ہے بالکل اسی طرح اس نے بھی اپنے دل کی ایک ایک بات جبران پر عیاں کر دی مگر اس کے باوجود آخر کیوں؟ اس کی بات ہوا میں اڑا دی گئی۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی ٹوٹن کا احساس کر رہا تھا۔ عجیب سی.....

جب بات پھولوں کی ہو تو ذہن میں کانٹوں کا بھی دھیان رہنا چاہئے، کانٹوں کو بھول کر صرف پھولوں کی نزاکت، حسن و رعنائی کا احساس رکھنا کوئی عقل مندی کی بات نہیں بلکہ احمقانہ فعل ہوگا۔ اب تو وہ احمق بن ہی چکا تھا۔

وہ تنہائیوں میں اپنے بارے میں سوچتا اور اپنی خرابیاں تلاش کرتا رہتا کہ وہ بدصورت ہے، بدکردار ہے، غیر مہذب...... آخر اس میں ایسی کون سی خرابی ہے، جس کی اس کو سزا مل رہی ہے، اس کے شب و روز، درد و غم سے لبریز کیوں؟ لیکن جواب ندارت۔ اور وہ جھنجھلاہٹ میں اپنے بال، اپنا چہرہ نوچنے لگتا تھا بہر حال وہ اس سزا سے گزر رہا تھا۔ اور اس کو کبھی کبھی اپنا

وجود لمحہ لمحہ موم کی طرح پگھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

پگھلنا بزدلی کی علامت ہوسکتا ہے مگر وہ قطعی بزدل نہیں تھا۔اس کے ذہن میں گھوم پھر کے ایک ہی سوال گونجتا رہتا کہ اس کو سزا کس بات کی مل رہی ہے۔اس کی اپنی شرافت،اعتماد.....حد سے زیادہ بھروسہ کرنا۔کیا اس کی سزا کی وجہ ہے؟لیکن وہ سزا بھگتنا نہیں چاہتا تھا اب....اور سزا بھگتنے کا سیدھا مطلب تھا مخالفت۔اس کے ذہن میں یہ بھی خیال تھا کہ وہ کس سے مخالفت مول لے لیکن اس کو کوئی ایک فیصلہ تو کرنا ہی تھا،نہیں تو...

اس کو کچھ کچھ یاد پڑ رہا تھا کہ جبران نے اس کو ایک کہانی سنائی تھی وہ کہانی کچھ اس طرح تھی۔جبران اپنے ایک دوست کی بارات میں گیا تھا۔بارات کوئی خاص نہیں تھی، بس بارات تھی دولہے میاں دوسرے دن جبران سے کہنے لگے،یار شادی میں تین چیزیں اہم مانی جاتی ہیں۔پہلی یہ کہ ہونے والی بیوی خوبصورت ہو۔دوسری یہ کہ پڑھی لکھی ہو۔تیسری چیز یہ کہ مالدار ہو......اگر ان تینوں میں سے ایک بھی چیز نہ ہو تو شادی معنیٰ نہیں رکھتی ہے۔

جبران نے اپنے دوست کی باتوں کو بغور سنا اور جواب دیا کہ یہ تینوں چیزیں نہ بھی ہوں تو بیوی نیک سیرت اور پیکرِ خلوص ہو تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر جبران کے دوست نے سوال قائم کیا؟اگر کردار مشکوک ہو جائے تو....؟اس پر جبران خاموش ہو گیا تھا۔

جبران نے بہت مزے لے لے کر اس کو یہ کہانی سنائی تھی،کہانی کے ایک ایک لفظ نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچادی تھی کیونکہ اس کی کہانی اور جبران نے جو کہانی سنائی تھی کافی یکسانیت تھی دونوں میں،وہ سوچ رہا تھا کہ یہ مماثلت اس نے اتنی دیر بعد کیوں محسوس کی؟ایک بوجھ تھا جو اس پر دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا اور اس کے ذہن نے مارے شدت کے کام کرنا بند کر دیا۔تو وہ بستر پر لیٹ گیا۔کافی دیر بعد وہ اٹھا۔منہ ہاتھ دھو کر اس نے چائے پی اور نکل پڑا،جبران کو ڈھونڈھنے۔اس کے دل و دماغ میں جبران کی سنائی ہوئی کہانی گونج رہی تھی۔

تلاش بسیار کے بعد ایک شراب خانے میں آخر کار جبران مل ہی گیا۔مدہوش، جبران کی حالت کچھ ایسی تھی کہ وہ اور پریشان ہو اٹھا۔ہوش میں لانے کی ترکیبیں جب کام نہیں آسکیں تو تھک ہار کر ایک کونے میں بیٹھ گیا اور ایک ٹک جبران کو دیکھنے لگا۔

دھیرے دھیرے رات گزرتی رہی اور صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو جبران کے جسم میں جنبش ہوئی، کچھ دیر بعد جبران آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا... تبھی اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ جبران خدا کی پناہ، اب ہوش آیا تم کو۔ جبران مخاطب ہوا اور حیرت سے بولا، میخائل، تم یہاں؟ ہاں جبران، میں تم کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آیا ہوں۔ میخائل نے جواب دیا۔

لیکن یہاں آنے کی کیا ضرورت آگئی، مجھے گھر سے بلوا لیتے جبران کے انداز میں بے رخی تھی۔ کام بہت ضروری تھا اسی لیے خود تمھاری تلاش میں نکل پڑا۔ میخائل نے وجہ بتائی۔

اچھا بتاؤ۔ کیا خاص کام ہے؟ جبران نے پوچھا اور میخائل نے بتانا شروع کیا کہ جبران، تم نے مجھ کو پچھلے دنوں اپنے ایک دوست کی کہانی سنائی تھی جو شادی کے دوسرے دن اس دوست نے تم کو بتایا تھا۔ اس کہانی کا نتیجہ کیا رہا؟

کون سی کہانی سنائی تھی میں نے تم کو۔ جبران کے چہرے پر غصہ تھا۔ مگر دوسرے ہی پل کچھ سوچتے ہوئے جبران کہہ رہا تھا تم ایک کہانی کے نتیجے کے لیے اسقدر بے چین ہو۔ آج ہر فرد کے پاس ایک کہانی ہے۔ اگر سب ہی تمہاری طرح پریشان ہو جائیں تو عالم کیا ہوگا اس دنیا کا؟ جبران کے لہجے میں طنز تھا۔ گھر جاؤ، میخائل ... میں شام کو آؤں گا تو کہانی کا نتیجہ اور تمہاری پریشانی دونوں کا حل بتاؤں گا۔

جبران کی باتیں سن کر میخائل اپنے گھر واپس چلا آیا اور شدت سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا، ہر آہٹ پر اس کو جبران کے آنے کا انتظار ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے جبران آگیا۔ آکر پہلے تو وہ مجھ کو کچھ دیر تک گھورتا رہا۔ مگر مجھ میں بے چینی بھری ہوئی تھی، میں نتیجہ جاننے کے لیے بیقرار تھا۔ جبران مجھ کو بتاؤ، میں شدت سے تمہاری بات سننے کا منتظر ہوں۔

میخائل بولا...... جبران کہہ رہا تھا۔ میرے دوست، سنو.... غور سے سنو..... گھٹ گھٹ کر مت جیو، زندگی کو نعمت جان کر جیو۔ جو تم کو پسند نہیں ہو اس میں زندگی مت تلاش کرو۔

جبران اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا....

اور میں ایک بکھرا ہوا وجود لیے ہوئے اس کو تکے جا رہا تھا۔ کمرے میں ایک بوجھل خاموشی پھیل چکی تھی۔

کوئی تو وقت ہوگا

مجھ سے اب نہیں چلا جا رہا ہے۔ تھوڑا رک لو......

اور سب لوگ رک گئے۔ پیڑوں کی گھنیری چھاؤں میں.... بابا... اب چلا جائے، نہیں تو رات ہو جائے گی۔ ہاں، بیٹا... چلو، اب کچھ راحت مل چکی ہے۔

یہ دس لوگوں کا قافلہ۔ اپنے لٹے پٹے حال میں، جنگلوں کے درمیان گذرتی ہوئی پگڈنڈی سے گزر رہا تھا۔ اس میں چار عورتیں تھیں اور باقی مرد... بچہ کوئی بھی نہیں تھا۔ سامان کے نام پر چند جھولے تھے۔ جن میں انتہائی ضروری سامان سفر تھا۔ لگا تار پانچ دن اور رات چلتے رہنے کی وجہ سے ان لوگوں کے پیروں میں سوجن آ چکی تھی، چھالے پڑ چکے تھے، چھالے پھوٹ کر اسقدر تکلیف دے رہے تھے کہ ایک قدم بھی چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ عورتوں کی حالت از حد خراب تھی۔ بہر حال چلنا تو تھا ہی اور نہ چلنے کا سیدھا سا مطلب تھا موت۔

جو اس قافلے کے سر پر منڈرا رہی تھی...

بابا... اب میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی ہوں۔ چاہے جو بھی انجام ہو.... نہیں، نہیں بیٹے، ایسا مت کہیے۔ ہر حالت میں آج یہ جنگل پار کرنا ہے۔ اپنی ممی اور بھائیوں کو دیکھو، آسمان والا ہم پر ضرور اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا ہے اپنے بندوں سے، ہم تو مظلوم ہیں۔ اٹھ، بیٹے..... اٹھ.... نہیں تو غضب ہو جائے گا۔

نہیں، مجھے اب اپنے منے کے پاس چلا جانے دو۔ مجھے اس کو دودھ پلانا ہے۔ وہ بہت بھوکا پہلے سے ہی تھا اب میں اور زیادہ اس کی بھوک کی تڑپ برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔ تمہیں سمجھاؤں اس کو اب میں اور خون نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

ارے یہ مجھے کیا ہوتا جارہا ہے؟ شاید چکر آرہا ہے۔

بابا...اب میں نہیں جاؤں گی۔نہیں جاؤں گی۔

نہیں ہمیں ہر حال میں چلنا ہے ایک گرد آلود جوان اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار کرنے لگا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو کچھ دیر کے لیے پھر یہ قافلہ رک گیا.....چلو،اب ضدمت کرو۔دیکھو سب لوگ تم کو ہی دیکھ رہے ہیں۔مگر مجھے تو منے کو دودھ پلانا ہے،وہ بہت بھوکا ہے۔اچھا یہ جنگل ختم ہو جانے دو تب پلا لینا۔نوجوان نے خالی خالی نگاہوں کو اطراف میں پھیلاتے ہوئے اس عورت کو اٹھایا جو اس کی بیوی تھی اور جس کا بچہ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر اس کی آغوش میں ہی دم توڑ چکا تھا۔وہ اس صدمے سے بے حال ہو چکی تھی،اس کی ذہنی حالت اچھی نہیں تھی،اور وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔

آخر کار جنگل پار ہو گیا۔پورا قافلہ خستہ حال تھا۔ہر فرد کی حالت بدتر تھی۔زخمی احساسات اور بدحالی نے ان کے تمام نقش ونگار چرا لیے تھے،قافلے کو مسلح فوج کی حفاظت میں ریلیف کیمپ تک لایا گیا تھا۔کیمپ کیا تھا؟...بس کیمپ تھا۔چاروں طرف درد ہی درد بکھرا پڑا تھا مجروح اور نیم مجروح لوگ تھے۔کسی کو اپنی فکر نہیں تھی کوئی اپنے بھائیوں کو دیکھ رہا تھا کوئی اپنے بیوی بچوں کو،ماں اپنے بچے کو تلاش کر رہی تھی تو کہیں شوہر اپنی بیوی کو۔بھائی اپنی بہن کو تلاش کر رہا تھا کہیں بہن بھائی کو۔عجیب وحشت اور افراتفری کا عالم تھا آہیں،سسکیاں،روتے ہوئے،بلکتے ہوئے لوگ،نا کپڑے کی خبر تھی اور نا پینے کی۔سب اپنے عزیز واقارب کو تلاش کر رہے تھے کھوج رہے تھے اور شدت جذبات سے رو رہے تھے۔

ریلیف کیمپ میں شام کو کھانا بانٹا جاتا تھا۔جب سے یہ ریلیف کیمپ لگایا گیا تھا۔روز صبح وشام کو گنتی ہوتی تھی کمبل اور کپڑے بھی دئے جاتے تھے۔ڈاکٹروں کا ایک پورا گروپ بیمار اور زخمیوں کی مدد کرتا۔یہ ریلیف کیمپ انٹرنیشنل ریلیف سوسائٹی نے لگایا تھا۔

انٹرنیشنل ریلیف سوسائٹی نے اپنے لگائے گئے کیمپ میں تمام لوگوں سے انٹرویوز بھی لیے تھے۔لوگوں نے اپنی تباہی اور بربادی کی مفصل باتیں بتائیں کہ کس طرح سے ان کو لوٹا گیا،ان کی عزتیں داغدار کی گئی تھیں،ان کے سرمائے کو لوٹا اور گھروں پر قبضہ کیا گیا اور ان

کے بھائی بہن، بیوی، بیٹی، شوہر اور بچوں کو ان کے ہی سامنے بڑی بے دردی سے ذبح کیا گیا۔ آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے۔ کل تک جو اپنے تھے وہی خون اور دولت وعزت کے پیاسے ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے ہی شیر خوار بچوں کو چھین کر پھینک دیا گیا۔ گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا، بوٹوں سے روند ڈالا گیا۔ یہ سب کیوں کیا گیا؟

مگر ان سب سوالوں کا جواب کون دے؟

مسلح افواج یا انسان نما بھیڑیوں کی بھیڑ.....کون دے گا؟

اشتعال انگیز تقریروں نے بھی قہر برپا کیا اور اخبارات کی سرخیوں نے نمک مرچ کا کام۔ انتظامیہ کی کھلی ہوئی یکطرفہ کاروائی، متعصب ذہنوں کی بھیڑ نے ایک پوری نسل کو برباد و تاراج کرنے کی قسمیں کھا رکھی تھی۔

ریلیف کیمپ میں ہر فرد کا اپنا الگ درد تھا۔ الگ رشتہ مگر کیمپ میں وہ سب ایک تھے، ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے پیتے اور سوتے تھے اور وطن کی یاد میں روتے تھے، اپنے اپنے قصے ایک دوسرے کو سنا کر غم ہلکا کرتے تھے مگر درد و غم کچھ اس طرح کا اور اس درجہ تھا کہ تمام کوششوں کے باوجود وہ رفع نہیں ہو رہا تھا۔ ماحول میں تلخی اور افسردگی ہمہ وقت رہتی تھی۔

میں بھی ریلیف کیمپ گیا تھا ضروری اطلاعات اکٹھا کرنے، وہاں کا منظر دیکھ کر میرا کیا بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل اٹھے۔ ہر فرد ایک کہانی لیے ہوئے تھا۔ میں نے سارا کیمپ دیکھنے کی سوچی۔ ایک کے بعد ایک.....لگاتار سات گھنٹے تک میں گھومتا رہا۔ رنج وغم کی ایسی بستی میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی، لاچاری، بے بسی، مظلومیت کا ایسا سمندر۔ میں اس کے لیے کون الفاظ اختیار کروں، کافی دیر تک غور وفکر کرتا رہا اور ایک جگہ تو میرے قدم خود بہ خود رک گئے۔ مجسم غم بنی ہوئی ایک عورت نجانے کس کو ایک ٹک تکے جا رہی تھی، اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی، خالی پن تھا، چہرے پر رنج وغم کی پرچھائیں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ کبھی شاداب رہا ہوگا، لب گلابی رہے ہوں گے مگر آج وہ یاسیت کی دیوی تھی۔ سفید کپڑوں میں اس کے اندر ایک طرح کی کشش چھپی ہوئی تھی جو پہلی نظر تو نہیں مگر ہاں کچھ دیر بعد ضرور عیاں ہوئی تھی۔

میں اس کے پاس ٹھہر گیا مگر وہ اپنے میں مگن تھی ایک چپ ہزار چپ، میں نے اس کو پکارا... زور سے آواز دی.... پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا تو وہ چونک پڑی۔ اس کی آنکھوں میں سوالات گونجنے لگے... میں نے کہا۔

آپ کہاں کھوئی ہوئی تھیں؟ میں نے کئی بار آواز دی۔ اس بات کو سن کر اس کا چہرہ اور بجھ گیا اور اس کی نگاہیں زمین پر گڑ گیں کچھ دیر بعد جب میں نے پھر کہا کہ آپ نے جواب نہیں دیا...... دیکھو، یہاں سبھی غم زدہ ہیں، تم بھی بول کر کچھ اپنا غم ہلکا کر لو۔ تو وہ بولی، میں کیا بولوں؟ میرا تو سب کچھ برباد ہو گیا، پورا کنبہ ہی فوجیوں نے مار ڈالا اور مجھے بھی مرا ہوا سمجھ کر چھوڑ گئے لیکن بدنصیبی مجھے یہاں تک کھینچ لائی۔ وہ اور کچھ کہتی کہ اتنے میں مسلح فوج کی حفاظت میں لٹے پٹے لوگوں کا ایک دستہ آ گیا۔ فضا میں آہیں اور سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔

اس لٹے پٹے جتھے کے ساتھ ایک معصوم سی تقریباً پانچ سال کی جگہ جگہ پھٹی ہوئی فراک پہنے، ننگے پیر اور، سر اور ہاتھ میں پٹیاں بندھی ہوئی بچی بھی تھی اس بچی کو دیکھ کر اچانک وہ مجھ سے باتیں کرنے والی عورت دوڑ پڑی۔ میں حیرت سے اس کو دیکھنے لگا کہ اس کو یہ اچانک ہوا کیا تھا؟ اس عورت نے اس زخمی بچی کو اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پیار کرنے لگی وہ بچی بھی نانی نانی کہتے ہوئے رو رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر میں ایک بار پھر آبدیدہ ہو اٹھا... مگر اس سے کیا ہو گا۔

☆☆☆

APNI MITTI KI MEHAK

(Short Stories)

by

Ashfaq Birather

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162.23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com